حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

اپریل 2018ء

30/- روپے

ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

ڈاکٹر رفیعہ سلیم کی مرتبہ کتاب ''لالی چودھری کے سفرنامے'' کی رسم اجراء پروفیسر شمیم حنفی کے ہاتھوں انجام پائی۔
(بائیں سے دائیں): پروفیسر ایس۔اے۔شکور، ڈائریکٹر/سکریٹری، تلنگانہ اردو اکادمی، جناب مجتبیٰ حسین، پروفیسر بیگ احساس،
پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر اشرف رفیع، جناب عزیز پاشاہ اور ڈاکٹر رفیعہ سلیم

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان وادب کے زیر اہتمام منعقدہ ''عالمی اردو کانفرنس'' کی افتتاحی تقریب میں شمع روشن کرتے ہوئے۔
پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائریکٹر NCPUL، کیرن گریس روفل (ٹورنٹو)، پروفیسر اظفر شمسی اور جناب حمید اللہ بھٹ

بیادگار سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۴ ماہ: اپریل سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہدعلی خاں

❁ معتمدعمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ

❁ ہندوستان: **300روپے**

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے

❁ کتب خانوں سے: **400روپے**

❁ مغربی وعرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

قیمت: **-/30**

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** **Fax: 040-23374448**

مراسلت وترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا مند پسند اور آزمودہ نسخہ

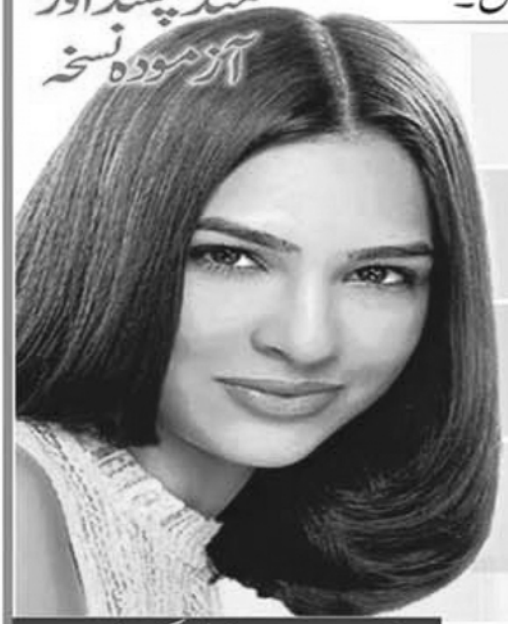

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

- کلونجی تیل
- کلونجی مساج آئیل
- کلونجی پین بام
- سفوف ظہیر
- اکسیر معدہ
- سفوف اپسرا
- سفوف دمہ
- کلونجی شوگر پاؤڈر
- کلونجی چیون پراش
- اکسیر جگر
- معجون کلونجی
- کلونجی شیمپو پاؤڈر
- مرہم کافوری
- روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

	بیگ احساس	06

مضامین

سرسید اور ہندوستانی زراعت	افتخار عالم خاں	08
اردو تحریک اور مسعود حسین خاں	مرزا خلیل احمد بیگ	13
مجتبیٰ حسین ایک اثر	ظفر کمالی	23
پروفیسر عبدالستار دلوی ایک ادارہ ساز شخصیت	سعیدہ پٹیل	31
جتیندر بلو کا آخری پڑاؤ	یٰسین احمد	37
پروین شاکر کی غزلوں میں عورت کا نسائی کرب	محمد زبیر	41
مثنوی چندر بدن و مہیار کے تاریخی ماٰخذات	شیخ جبین تاج	46

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا اشرف رفیع	51

طنز و مزاح

اردو ادب کے مہاراج کتھک	خامہ بگوش	53

شاعری

خالد عبادی، اکرم نقاش، کاشف بن قمر مرادآبادی، علیم صبا نویدی	اشرف رفیع، آغا سروش، بابر شریف، احمد فلک	56

افسانے

روح کا سرگم	نعیم کوثر	64
حصار	احمد رشید	69
آشواسن	وسیم عقیل شاہ	73

مطالعہ

ادب و ثقافت: ایک معروضی جائزہ	الطاف انجم	76

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	مرتضیٰ قادری، اصفیہ بانو، اشتیاق حیدر، حور فاطمہ	80

اداریہ

.....اورانسان مرگیا!

رسان گاؤں، ہری نگر، ضلع کٹھوعہ (جموں کشمیر) کی رہنے والی 8 برس کی لڑکی آصفہ بانو گھر سے غائب ہوگئی۔ رسان کے جنگلوں میں وہ کہیں گھوگئی۔ ایک ہفتہ بعد 17 رجنوری کو اس کی لاش مسخ شدہ حالت میں ملی۔ اس کم سن لڑکی کی اجتماعی عصمت ریزی کی گئی تھی اور بعد میں اسے قتل کر کے اس کی نعش جنگل میں پھینک دی گئی۔ آصفہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ آصفہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے کے باوجود پولیس نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ حکومت میں شامل ایک خاص طبقہ قتل اور عصمت دری کی تحقیقات میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ گمشدگی کی اطلاع کے بعد سے ان لوگوں کی یہ کوشش ہے کہ اس سلسلے میں سنجیدگی سے تحقیقات نہ ہوں۔ دوسری تشویش ناک بات یہ ہے کہ اس معصوم کے ساتھ جو درندگی کا کھیل کھیلا گیا اسے فرقہ وارانہ رنگ دیا جارہا ہے۔ نعش کے دستیاب ہونے کے باوجود جو ضروری کارروائی کی جاتی ہے اس میں بھی غفلت برتی جارہی ہے۔ گواہوں کے بیانات اور موقع واردات پر موجود انصاف کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو ڈرایا دھمکایا جارہا ہے۔ تحقیقات کی ذمہ داری اسپیشل انوسٹی گیشن ٹیم (SIT) سے لے کر دوسری انویسٹی گیشن ٹیم کو اور اب کرائم برانچ کو سونپ دی گئی ہے۔ ایک نابالغ لڑکے اور دو SPO کو گرفتار کیا گیا لیکن تحقیقات میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہورہی ہے۔ اس طرح ایک سے دوسری ایجنسی کو کیس منتقل کرنے میں خوف اس بات کا ہے کہ بہت سے ثبوت ضائع ہو جائیں گے۔ شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس سارے معاملے کو سیاسی اور مذہبی رنگ دیا جائے۔ پی ڈی پی اور بی جے پی کی مینگلس کے بعد دوسری پارٹیاں اس کو سیاسی رنگ دینے میں مصروف ہیں۔ ایک بے گناہ کم سن لڑکی جس بربریت کا شکار ہوئی اس کے خاطیوں کو سزا دینے کی کوشش کرنے کی بجائے سیاسی کھیل کھیلا جارہا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو اس معاملے کو الجھانے کے

بجائے ایک مظلوم کو انصاف دلانے کی کوشش کرنی چاہیے آصفہ کے غمگین خاندان کو ڈرانا اور دھمکانا بھی بند کیا جائے۔

دوسرا کیس اناؤ (یوپی) میں ہوا۔ ایک نابالغ لڑکی کی اجتماعی عصمت ریزی کی گئی۔ شدید احتجاج پر حکومت نے سی بی آئی کے ذریعہ تحقیقات کا وعدہ کیا ہے۔ یوگی حکومت نے اناؤ ریپ کیس میں بے عملی کا مظاہرہ کیا اور ملزم بی جے پی رکن اسمبلی کلدیپ سنگھ کو گرفتار کرنے یا اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے سے گریز کیا گیا۔ لکھنو میں خواتین نے سڑکوں پر اپنی چوڑیاں توڑ کر لا اینڈ آرڈر کے خلاف غصے اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ الہٰ آباد کورٹ نے نابالغ لڑکی کی گینگ ریپ کے خلاف کاروائی کرنے میں ایک سال کی تاخیر پر انتباہ دیا کہ اسے ریاست میں لا اینڈ آرڈر کی صورت حال ناکام ہوجانے کی رولنگ دینے پر مجبور ہونا پڑسکتا ہے۔ اب کہیں جا کر رکن اسمبلی کے خلاف ایف آئی آر درج کیا گیا ہے۔ ملک کے حالات دن بہ دن بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ وزیراعظم پارلیمنٹ کے بجٹ سیشن کے دوسرے مرحلے کو پوری طرح شوروغل کی نذر کردینے کے خلاف اُپواس رکھے ہوئے ہیں لیکن کیا وہ ان کمسن لڑکیوں کے ساتھ جو بربریت کا ننگا ناچ ہورہا ہے اسے روکنے کے لیے کچھ نہ کریں گے؟ کمزور طبقات کی لڑکیوں کی آبرو اس وقت خطرے میں ہے اور وحشی درندوں کے حوصلے بلند ہیں کیوں کہ حکومت انھیں سخت سزائیں نہیں دے رہی ہے مسئلہ کو سیاسی اور فرقہ وارانہ رنگ دے کر سارے معاملے کو برف دان کی نذر کیا جارہا ہے۔ ان مظلوموں کی آہ بے کار نہیں جائے گی۔ برسراقتدار طبقے کو ڈرنا چاہیے کیوں کہ بڑے بڑے ظالموں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اور اقتدار ہمیشہ قایم رہنے والی چیز نہیں ہے۔ ہم حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ملک میں لا اینڈ آرڈر کو مضبوط بنائے اور قصورواروں کو جلد سے جلد کیفر کردار تک پہنچائے۔ تاکہ دوبارہ اس طرح کے واقعات نہ ہوں۔ ایسا محسوس ہورہا ہے۔ جیسے انسان وحشی ہوگیا ہے۔ وہ معصوم اور نابالغ بچوں کو اپنی ہوس کا شکار بنارہا ہے۔ ہندوستان جہاں عورت کو دیوی کا درجہ دیا جاتا ہے ایسے جرائم اس کی تہذیبی روایت پر ایک بدنما داغ ہیں۔ ایسے تمام معاملات میں ہم کو مذہب وذات پات سے اونچا اُٹھ کر سوچنا چاہیے اور ایسے درندوں کا سر کچل دینا چاہیے۔

بیگ احساس

افتخار عالم خان

مضمون

سرسید اور ہندوستانی زراعت

سرسید کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ صرف مسلمانوں میں جدید اور سائنسی علوم کی تعلیم عام کرنے اور اُن کی سوشل اور ''کلچرل ریفارمس'' کرنے تک ہی محدود یا سیمت رہے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان یا ہندوستانیوں کے دوسرے، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں دکھلائی تھی۔ حالاں کہ یہ بھی ایک ایسی غلط فہمی ہے جس کے ذمہ دار بھی وہی لوگ قرار دیئے جاسکتے ہیں جو اپنے آپ کو سرسید کا پرشنسک یا عقیدت مند ٹھہراتے ہیں۔

سرسید نے اپنی روشن خیالی اور معاشرتی اصلاح کی تحریک کی ابتداء ہی ہندوستانی زراعت (ایگریکلچر) کی ترقی کے منصوبوں اور تدابیر سے کی تھی۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک تھا (اور ہے) اور زراعت کے زمرے میں ترقی کے بغیر ملک کی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی حقائق سے آگہی کے معاملہ سرسید کے شعور (Consciouness) کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شروع ہی سے (۱۸۶۴ء) سائنس اور زراعت کا رشتہ جوڑنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ سرسید نے اس کی ابتداء جدید زراعت سے متعلق علوم کی کتابوں کے ترجمے چھاپنے سے کی تھی جس میں نیچرل سائنس کے چھوٹے چھوٹے رسالہ شامل تھے جیسے ''علم آب'' کا رسالہ یا ''علم ہَوا'' کا رسالہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ انھوں نے جدید زراعت (Modern Agriculture) سے متعلق اسکاٹ برن کی مشہور کتاب ''ماڈرن انگلش فارمینگ'' کا ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ سرسید نے صرف کتابوں کے ترجمے ہی شائع نہیں کیے تھے بلکہ ہندوستانی زراعت کی اپنی ضروریات کی مطابقت سے کتابیں لکھوانے کی بھی کوشش کی تھیں۔ سرسید نے ۲۲/جولائی ۱۸۶۴ء کو لندن میں اپنے ایجنٹ مسرز استھم اینڈ کو کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

> ''میں یہاں ایک کتاب یوروپ میں استعمال کیے جانے والے انجنوں، مشینوں اور دوسرے زراعت میں استعمال ہونے والے اوزاروں کے بارے میں چھاپنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال سے انگریزی میں کوئی ایسی کتاب موجود ہونا مشکل ہے، جس میں یہ سب چیزیں ایک جگہ موجود ہوں۔ اس لیے میں سوسائٹی کی طرف سے لندن میں کسی قابل انجینئر کو یہ کام کرنے کے لیے مامور کرنا چاہتا ہوں۔ سوسائٹی اُس کو جو بھی آپس میں طے ہوگا محنتانہ ادا کرے گی۔
>
> انگریزی میں لکھے اس مخطوطہ کا ہم یہاں ترجمہ کرکے شائع کریں گے۔ اس لیے کتاب کو لکھتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جائے:
>
> ۱۔ چوں کہ یہ کتاب مقامی لوگوں کے لیے ہوگی جو اس طرح کی چیزوں سے قطعی ناواقف ہیں، اس لیے مصنف (رائٹر) کو ہر چیز کے

بارے میں معمولی سے معمولی
تفصیل کو اس طرح بیان کرنا
ہوگا کہ بالکل ہی ناواقف ذہن
بھی ان کو با آسانی سمجھ سکے۔

۲۔ اس میں جس مشین یا آلہ کا تذکر کیا
جائے اُس کے ایک ایک پرزے
کا حال شکلوں (figures) کے
ذریعہ سمجھایا جائے۔ پھر ان کو
جوڑ کر کسی طرح مشین کی شکل بنائی
جائے گی۔ نیز انگلینڈ میں اس
طرح کی مشین تجارتی پیمانے پر
تیار کرنے میں کس قدر خرچ آتا
ہے، اس کا تخمینہ بھی ضرور دیا
جائے۔ کسی مشین کو استعمال کرنے
کا طریقہ کے ساتھ اس مشین کے
ذریعہ ایک مقررہ مدت میں کتنا
کام کیا جاسکتا ہے اس کا اندازہ
بھی ضرور دیا جائے اور اس میں
خاص طور نیچے لکھی ہوئی مشینوں کو
شامل کیا جائے تو''۔[۱]

اور اس کے بعد زراعت میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے ہلوں، (خاص طور سے بھاپ کے انجن کی مدد سے چلائے جانے والے ہلوں (یعنی ایک طرح کا ابتدائی ٹریکٹر) اور کنوؤں سے پانی نکالنے والے پمپوں اور گیہوں اور جَو کو بھوسے سے الگ کرنے والی مشینوں وغیرہ کی لسٹ شامل کی گئی تھی۔ سرسید شروع ہی سے زراعت کے میدان میں نئی اور جدید ٹیکنالوجیز کو رائج کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ کاشت کاری کی جدید کاری (یعنی modernisation) کے سلسلے میں سرسید جن لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے اُن تک کتابوں کے ذریعہ رسائی تقریباً ناممکن تھی (کیوں کہ خواندگی کی شرح literacy rate چار فی صد سے بھی کم تھا) سرسید کو اس حقیقت کا علم تھا اسی لیے انھوں نے زراعت کے سلسلے میں اپنی بات عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ''آڈیو ویژال'' طریقے اپنانے کی کوششیں کی تھیں۔ مثلاً ٹیوب ویل (نل کا کنواں) لگانے کے طریقہ کو عام کرنے کے لیے سوسائٹی کے تجرباتی زراعت کے ڈپارٹمنٹ کے ذریعہ کسی کو بھی ضرورت پڑنے یا پوچھنے پر ہر طرح کی ٹیکنیکل جانکاری اور مدد فراہم کی جاتی تھی یعنی اس طرح کی جانکاری کہ یہ کام کس طرح کیا جاسکتا ہے اس کے لیے کیا کیا سامان درکار ہوگا جو کہاں سے اور کتنی قیمت پر دست یاب کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اس پورے کام کے لیے کتنی لاگت درکار ہوگی اور اس کے ذریعہ پانی کی کس قدر مقدر آب پاشی کے لیے مہیا ہوسکے گی۔ اسی کے ساتھ سوسائٹی کے انسٹی ٹیوٹ گارڈن میں ''ہنڈ پمپ'' کی بورنگ پر پمپ لگا کر آبپاشی کے لیے پانی فراہم کرنے کا طریقہ لوگوں کو عملی طور پر کر کے دکھلایا جاتا تھا۔ سرسید نے ۱۸۷۷ء میں خود تحریر کیا تھا کہ:

''اس وقت سوسائٹی کے پاس دو پمپ
تھے جن کو چلا کر آبپاشی کے لیے ان کا
استعمال دکھلایا جاتا تھا۔ سوسائٹی نے
ایک وی پمپ اور ایک امریکن ساخت کا
پمپ حاصل کیے تھے ان پمپوں کو پہلے
ہم نے خود استعمال کے لیے چلایا بعد
میں انھیں عام لوگوں کو تجربہ کے بطور چلا
کر دکھلایا جانے لگا تھا''۔[۲]

سائنٹفک سوسائٹی یا انسٹی ٹیوٹ میں سرسید نے تجرباتی زراعت (Experirnenatal Agriculture) کا ایک شعبہ

(یعنی ڈپارٹمنٹ) بھی قائم کیا تھا۔ جس کے ذریعہ انگلینڈ سے مختلف قسم کے بیج درآمد (import) کر کے نئے طریقہ سے ان کی بوائی، نلائی، سینچائی اور کٹائی کر کے لوگوں کو کاشت کرنے کے نئے طریقے سمجھائے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں اسکاٹ برن کی کتاب میں لکھے نئے طریقوں کے مطابق 'جو' اور 'گیہوں' کی کاشت کر کے اُس کے عمدہ نتیجے لوگوں کو دکھلائے گئے تھے۔ اسی کے ساتھ یورپین بیجوں کے ذریعہ مختلف قسم کی ترکاریوں کی کاشت کر کے اُن کے نتائج بھی لوگوں کو دکھلائے جاتے تھے۔ ایک سال امریکہ سے بیج درآمد کر کے 'کپاس' کی کاشت کر کے دکھلائی گئی تھی۔

سرسید زراعت کو ترقی دینے کے لیے زراعت یا کاشت کاری کے روایتی طریقوں کے بارے میں مکمل (یعنی پوری) معلومات جمع کرنا چاہتے تھے تاکہ ان اطلاعات کی بنیاد ہر جگہ کی اپنی ضروریات اور طور طریقوں کی مناسبت اور مطابقت سے اُس جگہ کے لیے 'مناسب' (Suitable) نئے طریقوں کا انتخاب (Selection) کیا جاسکے۔ سرسید نے اپنی اسی ''زراعتی ترقی کے منصوبہ'' (یا پلان) کی تفصیلات (Details) علی گڑھ کے کلکٹر مسٹر ایس ایچ پرنسپ کے نام لکھے اپنے مؤرخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے خط میں نہایت وضاحت (Clearly) سے درج کی تھیں۔[۳] اس خط سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید ہندوستان کی زرعی ترقی کے کام میں کتنے انہماک سے مصروف تھے اور اِن کے خیالات اور طریقہ کار (یعنی کام کرنے کا طریقہ) کتنا سائنٹفک تھا۔ آج جس طرح ''مناسب ٹیکنالوجیز'' (Suitainable Technologies) یا ''ماحول دوست ٹیکنالوجیز (Environment friendly) کی اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے اور کسی بھی نئی ٹیکنالوجی کو ملک میں رائج کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ''ماحول دشمن'' ٹیکنالوجی تو نہیں ہے جو بعد میں ماحول میں کثافت پھیلائے یا ایکالوجیکل بیلنس (ماحولیاتی توازن) کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔ اسی کے ساتھ ''مناسب ٹیکنالوجیز'' (Sustainable technologies) سے مراد وہ ٹیکنالوجیز ہوتی ہیں جن کو اگر لوگوں میں رائج کیا جائے تو وہ اُن کے رسم ورواج، رہن سہن اور معاشی حالات سے بھی مناسبت رکھتی ہوں (میل کھاتی ہوں) تاکہ وہ اُن کو بآسانی قبول کرسکیں اور اُن کو اپنی زندگی کا حصہ بناسکیں۔ ہندوستان میں اس زمرے میں بغیر دھویں کے چولہے، سولر کوکر، گوبر گیس پلانٹ، وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سرسید بھی اپنے خط میں بہت واضح طور پر تحریر کرتے ہیں کہ ہمیں سب سے پہلے اپنی موجودہ (رائج) روایتی زراعتی طور طریقوں کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔ تاکہ ہم یہ طے کرسکیں کہ ہمارے کون سے روایتی (Teaditional) طریقے پرانے یا خراب ہیں جن کو ہمیں فوراً جدید یا نئے طریقوں سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ جدید طریقوں میں سے بھی ہمیں اُن طریقوں کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہمارے رسم ورواج اور رہن سہن کی مناسبت سے ہمارے لیے سب سے زیادہ بہتر ہوں۔ یعنی جدید طریقوں میں سے بھی ہمیں اپنی ضروریات کی مناسبت سے کوئی طریقہ چننا ہوگا۔ ہمارے خیال سے سرسید کی یہ ایک نہایت جدید (Modern) اور سائنٹفک سوچ تھی اور اُس وقت کے حالات میں اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ تجویز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سرسید کا خیال تھا کہ زراعت میں کل جہتی (All rounded) ترقی کی ضرورت ہے، یعنی ایک دو چیزوں میں تبدیلی یا ترقی سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں کیے جاسکتے ہیں اس کے لیے ترقی کا ایک کل جہتی منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے۔ سرسید کا کہنا تھا کہ ہمارا پہلا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ زمین کی مالیت (پیداوار) بڑھائی جائے جس کے لیے اچھے بیج، اچھی کھاد، اور آب پاشی کے ذریعوں کے ساتھ کسانوں اور ان کے مویشیوں کی اچھی صحت ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۸۷۸ء میں گورنمنٹ نے فارسٹ ایکٹ پاس کر کے جنگلوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا جس کی وجہ سے دیہی آبادی (یعنی ہمارے کاشت کار) جنگلوں سے ملنے والے ایندھن اور مویشیوں کی چراگاہوں سے محروم ہوگئی تھی۔ سرسید کا خیال تھا کہ اس کا سیدھا اثر ملک کی پیداوار پر ہوا تھا۔ گوبر جو پہلے کھاد کے لیے استعمال ہوتا تھا اب مجبوراً کاشت کار اسے ایندھن کے بطور استعمال کرنے لگے تھے اس لیے فصلیں گوبر کی کھاد سے محروم ہوگئی تھیں۔ اس سلسلے میں سرسید تحریر کرتے ہیں:

''گوبر جو سابق میں زیادہ تر کھانے کے کام آتا تھا اب کثرت سے بطور ایندھن کے کام میں آتا ہے۔ اس وجہ سے غریب کاشت کار گوبر کو بطور ایندھن کے فروخت کرنے پر مائل ہے''۔۴

اسی طرح چراہ گاہوں کی کمی کا اثر بھی پیداوار پر پڑا تھا۔ اس سلسلے میں سرسید کا خیال تھا کہ چراگاہوں کی کمی کی وجہ سے مویشیوں کی صحت میں واقع ہونے والی کمزوری بھی پیداوار کی کمی کا سبب بنی تھی، سرسید تحریر کرتے ہیں:

''زمین اتنی دفعہ نہیں جوتی جاتی جو فصل کے لیے کافی ہو جس سے فصل کو نقصان ہوتا ہے۔ یہ نقص بیلوں کی قوت سے منسوب کیے جاسکتے ہیں۔ جو بیل کاشت کاروں کے پاس ہوتے ہیں اُن میں جسمانی قوت کم ہوتی ہے''۔۵

اس لیے مویشیوں کی نسل کی بہتری کا کام بھی بہت ضروری ہے اس سلسلے میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ:

''ان تدبیروں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جن سے بھیڑ بکری اور مویشیوں اور تمام قسم کے پرندوں کی نسل جو کھیتی سے تعلق رکھتے ہیں، درست ہوئے''۔۶

ساتھ ہی مختلف معدنیات (Minerals) کی کھوج کے لیے ملک کا سروے کروانا بھی ضروری ہے تاکہ ان معدنیات سے عوام فائدہ اٹھا سکیں۔

سرسید کا کہنا تھا کہ ملک میں زراعت کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دیہاتوں اور گاؤں میں رہنے والے زراعت سے جڑے لوگوں (یعنی کسانوں) اور اُن کے خاندانوں کے رہن سہن کو بہتر بنانا ضروری ہے تاکہ وہ صحت مند رہیں جس کے لیے ضروری ہے گاؤں میں گھر، گلیاں، محلّہ، صاف ستھرے اور کشادہ ہوں، مکانات ہوادار بنائیں جائیں، راستہ صاف ستھرے ہوں، راستوں پر درخت لگائے جائیں تاکہ صاف ہوا ملے جو تنگ گلیوں اور بند مکانوں میں انھیں نہیں ملتی ہے۔ سرسید نے دیہاتوں میں، رہن سہن کی خرابیوں کی نشان دہی اس طرح کی تھی:

''(۱) نہ پہنچنا صاف اور تازہ ہوا کا
(۲) نہایت گنجان ہونا مکانوں کا
(۳) نہ ہونا پانی کا اچھا بہاؤ اور نکاس
(۴) جمع ہونا گلی کوچوں میں غلاظت اور سڑی ہوئی چیزوں کا۔
(۵) بگڑنا ہوا کا، بخارات متعفن اور زہر آلود سے جو بند اور غلیظ جھیل، تالاب، گڑھوں کے سڑے پانی سے نکلتے ہیں۔
(۶) پینا غلیظ پانی کا یعنی تالاب و جھیل وغیرہ کے پانی کا''۔۷

سرسید نے ۱۸۷۸ء میں ایک کتاب ''قدیم نظام دیہی ہندوستان'' کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے نہایت تفصیل سے دیہاتوں میں رائج روایتی معاشرے اور

زراعت سے جڑے کسانوں، مزدور (اور دوسرے ہنرمندوں) کی طرزِ زندگی، رسم ورواج اوران کی معاشی ومعاشرتی ترقی کے لیے کی جانے والی ضروری تدابیر اور اصلاحات کا بیان درج کیا تھا، اسی کے ساتھ ۱۸۷۹ء میں سرسید نے ایک تفصیلی یادداشت (Memorandum) بابت ''ترقی حقیقت آراضی وامداد کاشت کاران وتقرر بینک ہائے زراعتی'' شائع کی تھی جس میں کاشت کاروں کے معاشی حالات سدھارنے اور اُنھیں معاشی راحت پہنچانے کے لیے بہت سے مروجہ قوانین میں ترمیموں کے ساتھ، کسانوں کو مہاجنوں کے قرضوں اور من مانی سود کی دروں سے چھٹکارادلانے کے لیے سرسید نے فوری طور پر دیہی بینکوں (Rural Banks) کے قائم کرنے کی پُرزور سفارش کی تھی۔

اسی کے ساتھ سرسید کا یہ بھی قومی خیال تھا کہ ملک میں ایگریکلچر کالج'' قائم کرنا بے حد ضروری، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''بابوکشن مکھرجی نے حال میں بنگال گورنمنٹ کو نہایت معقول مشورہ دیا ہے کہ ایک مدرسہ کاشت کاری کا مقرر ہو اوراس میں کاشت کاری کا فن تجربہ کے ساتھ ہندوستانیوں کو سکھلایا جائے''۔[۸]

آخیر میں میں اپنی بات سرسید کی اس خواہش پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے ریٹائرمنٹ کے وقت تحریر کی تھی:

''اب ریٹائرمنٹ کے بعد یہ میری دلی خواہش ہے کہ میں زراعت اور بائنی کے میدان میں تجربات کروں اور اُن کے نتائج ملک کی مقامی زبان (ورنا کیولر) میں شائع کروں''۔[۹]

☆☆☆

حواشی

۱۔ سرسید کا خط، مؤرخہ ۲۲؍جولائی ۱۸۶۴ء، بنام میسرز اسمتھ اینڈ کو، لندن، آرکایوز، سرسید اکیڈمی، سرسید ہاؤس، علی گڑھ

۲۔ سلیکٹیڈ ڈاکومنٹس، مرتبہ یوسف حسین خاں، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۲۰

۳۔ سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی، مصنفہ افتخار عالم خاں، مکتبہ جامعہ، دہلی، (۲۰۰۰ء)

۴۔ یادداشت نسبت ترقی حیثیت آراضی، مصنفہ سید احمد خاں، بحوالہ مقالات سرسید (حصہ ۱۶)، ص: ۵۹۹

۵۔ ایضاً، ص: ۵۹۹

۶۔ سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی، مصنفہ افتخار عالم خاں، مکتبہ جامعہ (۲۰۰۰ء) دہلی، ص: ۱۰۹-۱۱۱

۷۔ سلیکٹیڈ ڈاکومنٹس، مرتبہ یوسف حسین خاں، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۲۰

۸۔ ہمارے روسا اور قومی بھلائی، مصنفہ: سید احمد خاں، اخبار سین ٹیفک سوسائٹی مورخہ ۱۲؍جولائی ۱۸۶۶ء

۹۔ سرسید کا میمورنڈم، مؤرخہ ۲۴؍جون ۱۸۷۷ء، بحوالہ سرسید اور سائنٹفک سوسائٹی، مصنفہ: افتخار عالم خاں، ص: ۱۱۶

مرزا خلیل احمد بیگ

مضمون

اردو تحریک اور مسعود حسین خاں

بعض محققین کا خیال ہے کہ اردو کے عروج کا زمانہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال (1857) کا زمانہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے محض دس سال بعد ہی سے اردو کے زوال کی بھی داستان شروع ہو جاتی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ 1867 میں متحدہ صوبہ جات (United Provinces)، جسے اب اتر پردیش کہتے ہیں، کے بعض ہندو حکومتِ برطانیہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سرکاری زبان اردو کو، جسے 1837 میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا، کو ختم کر کے اس کی جگہ دیوناگری رسمِ خط میں لکھی جانے والی ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کیا جائے۔ ان اردو مخالف سرگرمیوں میں بنارس کے بابو شیو پرساد (1823-1895)[1] پیش پیش تھے۔ بعد میں پنڈت مدن موہن مالویہ (1861-1946)[2] بھی ہندی کی حمایت میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے اوائل میں کئی ہندو تنظیمیں معرضِ وجود میں آئیں جن میں ناگری پرچارنی سبھا (جو بنارس میں 1893 میں قائم ہوئی تھی)، اور ہندی ساہتیہ سمیلن (جس کا قیام الٰہ آباد میں 1910 میں عمل میں آیا تھا) خاص ہیں۔ ان تنظیموں کے زیرِ تحت ہندی تحریک کا باقاعدہ طور پر آغاز ہوا۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ہندوؤں کی یہ تحریک اردو کے لیے خطرہ بنتی جا رہی ہے تو انھوں نے اردو کے تحفظ و دفاع کے بارے میں سوچنا شروع کیا جس نے رفتہ رفتہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ سرسید احمد خاں (1817-1898) اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اردو کے خلاف ہندوؤں کی یہ تحریک مسلم مخالف رُخ اختیار کرتی جا رہی ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت سے متحد رہنا ممکن نہ ہو سکے گا۔[3]

ہندی تحریک زور پکڑتی گئی اور ہندوؤں کا سیاسی محاذ پر دباؤ بڑھتا گیا، چنانچہ برطانوی حکومت کو اپنی لسانی پالیسی پر از سرِ نو غور کرنا پڑا۔ بالآخر یوپی (متحدہ صوبہ جات) کے لفٹیننٹ گورنر سر انٹونی پیٹرک میکڈانل (Sir Antony Patrick Mac Donnell) نے، جو مسلمانوں کے خلاف دل میں کینہ رکھتے تھے اور ہندوؤں کے زبردست حمایتی اور بہی خواہ تھے، 19 اپریل 1900 کو ایک آرڈیننس (Ordinance) جاری کر کے سرکاری سطح پر ہندی کو اردو کے برابر درجہ دے دیا جس کی رو سے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے ساتھ دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی ہندی بھی رائج ہو گئی۔ ہندوؤں نے حکومت کے اس فیصلے کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، لیکن مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، اور انھوں نے اس وقوعے (Event) پر اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا۔ اس وقت تک سرسید احمد خاں کا انتقال ہو چکا تھا، چنانچہ اردو تحریک کی باگ ڈور نواب محسن الملک (1837-1907)[4] نے سنبھالی جو سرسید احمد خاں کے دستِ راست تھے۔ وہ اس وقت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M A O College) کے آنریری سکریٹری تھے۔ انھوں نے اردو تحریک کو جِلا بخشی اور اردو کے تحفظ و بقا اور دفاع کے لیے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن (Urdu Defence Association) کی تشکیل کی۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام کئی مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ اس کا

پہلا جلسہ 13 مئی 1900 کو علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس سرگرمی سے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو مہمیز ملی۔ لفٹیننٹ گورنر انٹونی میکڈانل کو جب اس کا پتا چلا تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے سید محمود[5] (1850-1903) کو ایک خط لکھ کر اردو دفاعی تنظیم کی سخت نکتہ چینی کی، لیکن محسن الملک اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور اردو کے دفاع میں مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ گورنر نے اسے اپنی سبکی سمجھی اور علی گڑھ آ دھمکے۔ ایم. اے. او. کالج کے ٹرسٹیز (Trustees) کی ہنگامی میٹنگ طلب کی اور اردو کے تحفظ و بقا کے لیے جو کچھ ہو رہا تھا اس پر اپنی سخت ناگواری اور برہمی کا اظہار کیا اور دھمکی دی کہ اگر حکومت کی پالیسی کے خلاف عوامی جلسے اور احتجاجی سرگرمیاں جاری رہیں تو حکومت کی جانب سے کالج کو دی جانے والی مالی امداد بالکل بند کر دی جائے گی۔ نواب محسن الملک کے ساتھ بھی ان کا رویہ نہایت ہتک آمیز تھا۔ انھوں نے جب گورنر سے ملنا چاہا تو گورنر نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ انھیں جو کچھ کہنا ہے، خط لکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ نواب محسن الملک نے جب دیکھا کہ ہندی-اردو تنازع پر حکومت کے فیصلوں کی مخالفت سے کالج کے مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہے تو انھوں نے کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا اور خود کو اردو کے کاز کے لیے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا، لیکن کالج اور قوم کے بہی خواہوں کے نزدیک محسن الملک کے بغیر کالج کا تصور ناممکن تھا، چنانچہ سرسید احمد خاں کے دوستوں کے پیہم اصرار پر محسن الملک نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا، لیکن شرط یہ رکھی کہ کالج کے سکریٹری کے عہدے کے ساتھ وہ ذاتی طور پر اردو کے تحفظ و بقا کے لیے بھی کام کرتے رہیں گے۔ اب سیاسی حالات بدل چکے تھے، لفٹیننٹ گورنر انٹونی میکڈانل جا چکے تھے اور یوپی کے گورنر کا عہدہ سر جیمز لاٹوش (Sir James La Touches) نے سنبھال لیا تھا، تبھی محسن الملک نے سرسید احمد خاں کی قائم کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (1886) کی ایک وِنگ (علمی شعبے) کے طور پر 1902 میں علی گڑھ میں انجمن ترقیِ اردو کی تشکیل کی جس نے اردو کے تحفظ و بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے، اور اردو تحریک کے کام کو آگے بڑھایا۔ دس سال بعد 1912 میں جب مولوی عبدالحق (1870-1961) انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے تو اس کے کام میں اور بھی تیزی آ گئی۔ وہ انجمن کو اپنے ساتھ اورنگ آباد (دکن) لے گئے جہاں وہ پہلے سے ملازم تھے۔ اورنگ آباد میں اپنے قیام کے دوران میں تقریباً ربع صدی تک وہ نہایت تندہی اور یکسوئی کے ساتھ اردو کے تحفظ و بقا اور فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ سنہ 1938 میں انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی منتقل ہو گیا اور مولوی عبدالحق بھی دہلی آ گئے، لیکن 1947 میں تقسیمِ ملک کے وقت اردو کے لیے حالات نہایت ناسازگار ہو گئے۔ انجمن کا دفتر جو دریا گنج میں واقع تھا بلوائیوں کے ہاتھوں لٹ گیا، اس کا کتب خانہ تباہ و برباد ہو گیا، کتابوں اور مسودات کا قیمتی ذخیرہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ مولوی عبدالحق یہاں کے ناگفتہ بہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے اور وہاں نئے سرے سے انجمن کی بنیاد ڈالی جو انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کے نام سے موسوم ہوئی، جو کراچی میں آج بھی قائم ہے، اور اردو کے فروغ کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ مولوی عبدالحق کو ان کی بے بہا اردو خدمات کے لیے 'بابائے اردو' کے خطاب سے نوازا گیا۔ پاکستان میں بھی وہ تادمِ آخر بابائے اردو ہی کہلائے اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولوی عبدالحق کے کراچی چلے جانے کے بعد انجمن ترقیِ اردو بے سروسامانی کے عالم میں دہلی سے علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ یہاں اسے سلطان جہاں منزل (واقع شمشاد مارکیٹ) کے ایک گوشے میں پناہ ملی، لیکن تیس سال بعد یہ 1977 میں پھر نئی دہلی منتقل ہو گئی اور اب بھی وہیں ہے۔[6] قاضی عبدالغفار (1889-1956) 1947 کے بعد کی انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے

پہلے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے جنھوں نے اس کے تنِ نیم جان میں نئی روح پھونکی، اور یہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

آزاد ہندوستان میں اردو کے لیے فضا سازگار نہ تھی۔ فرقہ واریت اور لسانی عصبیت کا بازار گرم تھا۔ اس کے مخالفین اسے مٹانے اور نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔ سرکاری سطح پر اس کے لیے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ہر طرف قومی زبان کا مسئلہ چھایا ہوا تھا۔ گاندھی جی (1869-1948) ہندی، اردو کی صف آرائی سے حد درجہ ملول تھے۔ وہ اسے اس ملک کی ''بدقسمتی'' سمجھتے تھے۔ ایسے عالم میں انھوں نے 'ہندوستانی' کا نعرہ بلند کیا۔ یہ اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ 'ہندوستانی' عربی فارسی (Perso-Arabic) اور دیوناگری دونوں رسومِ خط میں لکھی جائے اور یہی ہندوستان کی 'راشٹر بھاشا' (قومی زبان) تسلیم کر لی جائے۔ گاندھی جی نے قومی زبان کے مسئلے کا یہ حل بہت سوچ سمجھ کر نکالا تھا، لیکن اہلِ سیاست نے اس پر کان نہیں دھرا اور ان کی یہ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ ہندی (دیوناگری رسمِ خط میں لکھی جانے والی زبان) کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اردو پر کس مپرسی کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ ایک اقلیتی زبان بن کر رہ گئی جس کا نہ کوئی علاقہ تھا اور نہ جسے کسی قسم کی مراعات حاصل تھیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے نئے سکریٹری قاضی عبدالغفار کے لیے اردو کے تحفظ و بقا کا مسئلہ ایک بہت بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا، لیکن انھوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور مرتے دم تک اردو کی لڑائی لڑتے رہے۔

قاضی عبدالغفار ادیب و انشاپرداز اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ اردو تحریک کے علم بردار بھی تھے۔ انھوں نے انجمنِ ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کے تحفظ و بقا اور اس کے آئینی و دستوری حقوق کے لیے منصوبہ بند طریقے سے جو اقدامات کیے اسے ہم اردو تحریک کا ایک روشن باب کہہ سکتے ہیں۔

جب اتر پردیش کے سرکاری اسکولوں سے اردو خارج کر دی گئی اور وہ بچے جن کی مادری زبان اردو تھی، اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہو گئے تو قاضی عبدالغفار نے یہ طے کیا کہ ایک وفد کی شکل میں وزیر تعلیم سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ اس کے لیے تیاری شروع کر دی گئی اور شہر لکھنؤ کے صرف ایک حصے سے ان والدین اور سرپرستوں کے دس ہزار دستخط حاصل کیے گئے جن کے بچے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بعد ازاں انجمنِ ترقی اردو (ہند) کے سات اراکین پر مشتمل ایک وفد نے ڈاکٹر ذاکر حسین (1897-1969)، صدرِ انجمن کی قیادت میں 23 مئی 1951 کو اتر پردیش کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سمپورنانند (1891-1969) سے ان کے دفتر میں ملاقات کی، اور انجمن کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی، لیکن افسوس کہ انجمن کی اس جدوجہد کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، کیوں کہ حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے باوصف قاضی عبدالغفار نے ہمت نہیں ہاری اور اردو کو اس کا آئینی حق دلوانے کے لیے ایک زبردست عوامی تحریک کا آغاز کر دیا، کیوں کہ ان کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اردو کو دستورِ ہند کی دفعہ 347 کے تحت صدرِ جمہوریہ کی ہدایت پر علاقائی زبان قرار دیا جا سکتا ہے اور سرکاری طور پر اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ علاقائی زبان کی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اتر پردیش میں بہت بڑے پیمانے پر دستخطی مہم کا آغاز ہوا۔ قاضی عبدالغفار نے یہ واضح کر دیا تھا کہ یہ تحریک قطعی طور پر غیر سیاسی ہے اور اس کا مقصد محض اردو کو اس کا حق دلوانا ہے جس کی صراحت دستورِ ہند کی دفعہ 347 میں موجود ہے۔ جب بیس لاکھ دستخط جمع ہو گئے تو انجمنِ ترقی اردو (ہند) کے ایک وفد نے جس کی قیادت انجمن کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے کی تھی اور جس میں علاوہ اور لوگوں کے قاضی عبدالغفار بھی شامل تھے، صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجیندر پرساد

(1884-1963) سے یکم فروری 1953 کو ملاقات کی، لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور قاضی صاحب 17 جنوری 1956 کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس طرح اردو تحریک کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔ قاضی عبدالغفار کے بعد پروفیسر آل احمد سرور (1911-2002) انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان کے دور میں بھی اردو کے مسائل جوں کے توں رہے۔ وہ انجمن کے ترجمان ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے توسط سے اردو کی وکالت کرتے رہے اور اردو کے مسائل اور اردو بولنے والوں کے مطالبات کی جانب مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ اسی زمانے میں پروفیسر مسعود حسین خاں (1919-2010) نے بھی ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے اداریوں اور اس میں شائع ہونے والے کالم 'میرا صفحہ' کے تحت مضامین لکھ کر اردو تحریک میں جان ڈالی۔

مسعود حسین خاں اردو کے ممتاز ادیب و انشا پرداز، محقق اور ماہرِ لسانیات تھے۔ انھوں نے اردو تحریک کے فعال قلم کار کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، قاضی عبدالغفار کے بعد آل احمد سرور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ اکثر ان کی غیر موجودگی میں مختلف زمانوں (سال 1969، 1970 اور 1972 کے دوران) میں مسعود حسین خاں نے انجمن کے جنرل سکریٹری کے فرائض انجام دیے اور ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بڑی بیباکی اور جرأت مندی کے ساتھ اس کے اداریے قلم بند کیے۔ تقریباً اسی زمانے میں انھوں نے 'ہماری زبان' کے کالم 'میرا صفحہ' کے تحت بھی اردو کے مسائل پر مختصر انداز میں مضامین بھی لکھے۔ 'ہماری زبان' میں تحریر کردہ مسعود حسین خاں کے ان اداریوں اور مضامین کو راقم السطور نے مرتب کر کے کتابی شکل میں 'اردو کا المیہ' کے نام سے 1973 میں شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے شائع کر دیا۔ 'عرضِ مرتب' کے عنوان کے تحت اس کتاب کے دیباچے میں راقم السطور نے ان خیالات کا اظہار کیا:

> ''ان کے [مسعود حسین خاں کے] تحریر کردہ یہ مضامین ہندوستان میں اردو کی لسانی صورتِ حال کا نہ صرف صحیح جائزہ پیش کرتے ہیں، بلکہ ان سے اردو کے موقف کی بھرپور وضاحت و حمایت بھی ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں اردو کے دستوری و جمہوری حقوق کو منوانے کا عزمِ مستحکم بھی ملے گا اور تعلیمی اداروں، سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اس کے از سرِ نو نفاذ کی پیہم کوششیں بھی نظر آئیں گی... اردو جس طرح روز بروز ہمارے گھروں اور تعلیم گاہوں کو خیرباد کہہ رہی ہے اور آنے والی نسلیں جس طرح اس سے منہ موڑتی جارہی ہیں، یہ مضامین اس لسانی المیے کی مختصر داستان بیان کرتے ہیں۔ ان میں اردو کے ساتھ اربابِ حکومت کی ناانصافیوں کا شکوہ بھی ہے اور ابنائے وطن کے لسانی تعصّبات کا گلہ بھی، اپنی کوتاہیوں پر پشیمانی کا اظہار بھی ہے اور اپنی بے بسی پر افسوس کی ترجمانی بھی۔ ان میں اردو کے تعلیمی نظام کے درہم برہم ہوجانے کا غم بھی ہے اور موجودہ نسلوں کے اپنی زبان سے محروم ہوجانے کا قلق بھی۔''

پروفیسر رشید احمد صدیقی (1894-1977)، مسعود

حسین خاں کے ان اداریوں کو پڑھ کر اکثر اپنی رائے کا خطوں کے ذریعہ اظہار کرتے تھے۔ان میں سے بعض خطوں کے اقتباسات کو 'اردو کا المیہ' کا پیش لفظ بنا دیا گیا ہے۔13 مارچ 1970 کے خط میں انھوں نے مسعود حسین خاں کو لکھا:

''آپ کا شمار مَیں ان چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں جو ہندوستان میں اِن دنوں اردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں۔''(7)

اسی طرح 11 دسمبر 1969 کے خط میں انھوں نے مسعود حسین کو لکھا:

''جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کیے ہیں اردو کے معرکہ آرا مسائل پر اس اختصار و جامعیت کے ساتھ ایسے خوبصورت اسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی بھی مضمون کم سے کم میری نظر سے نہیں گذرا، مدتوں پہلے سے بھی۔''(8)

5 جنوری 1970 کے خط میں وہ انھیں لکھتے ہیں:

''میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جب سے آپ نے 'ہماری زبان' کی ادارت کا کام اپنے ذمے لیا ہے، آپ کی تحریر میں اردو سے متعلق امید و عزم کی وہ تازگی و تابناکی آ گئی ہے جس کا مَیں ہمیشہ سے متمنی رہا۔''(9)

مسعود حسین خاں ایک لسانی مؤرخ اور ماہرِ لسانیات تھے۔ وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اردو زبان کیسے پیدا ہوئی اور کن عوامل نے اس کی تشکیل کی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس زبان کا جنم مخصوص حالات میں ہوا ہے۔ یہ صدیوں کے تہذیبی عمل میں ڈھل کر نکلی ہے۔اس زبان کی تشکیل میں رواداری، مفاہمت، لین دین کا جذبہ اور ہندوستانی قومیت کے خد و خال، سب شامل ہیں۔ اردو ہماری ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کا شاہکار ہے۔ اس میں ہم صدیوں سے چاہ اور نباہ کرتے چلے آئے ہیں۔اس میں ایک مخلوط زبان کی ساری توانائی، اظہار کی بے پناہ قوت، تکلف و آداب کی ساری نزاکتیں، سب و شتم کی جملہ فصاحتیں موجود ہیں۔''(10)

اپنے ایک اور اداریے ''زبانوں کا عروج و زوال'' میں وہ اردو زبان کی تاریخ یوں بیان کرتے ہیں:

''اردو ایک ایسے سیاسی و تہذیبی انقلاب کی یادگار ہے جو اس ملک میں ازمنہِ وسطیٰ میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کے داخلۂ ہند کا ایک لازمی تہذیبی تتمہ تھا۔ فارسی اس عہد کی تہذیبی و سرکاری زبان تھی، لیکن وہ بھی انگریزی کی طرح عوامی نہیں بن سکتی تھی، اس لیے اس کے سہارے سے ایک عوامی محاورے کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ۱۲۰۰ء سے لے کر ۱۵۰۰ء تک اردو زبان کی تشکیل کا زمانہ تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک اس میں اعلیٰ ترین شعری تخلیقات ہو چکی تھیں۔ انیسویں صدی کے آغاز سے یہ جدید نثر سے آشنا ہوئی اور

سرکاری وعدالتی حیثیت سے شمالی ہند کے بڑے حصے میں رائج ہوگئی۔ عام مقبولیت کے اعتبار سے یہ زمانہ اس کا نقطۂ عروج تھا، ہر چند علمی و تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ اپنے منتہا کو بیسویں صدی کے آغاز کے وقت پہنچی۔'' (11)

مسعود حسین خاں نے سطورِ بالا میں اردو زبان کی چھے سو سالہ تاریخ بیان کردی ہے، لیکن عین اس وقت جو اردو کے عروج کا زمانہ تھا، انگریزوں نے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس نے ہندوؤں کے لیے ایک علاحدہ زبان کھڑی بولی ہندی کو جنم دیا۔ ہندوؤں میں جیسے جیسے ''قومیت'' کا رجحان اور ''سیاسی شعور'' بڑھتا گیا کھڑی بولی ہندی کی تحریک بھی زور پکڑتی گئی جیسا کہ اس زمانے کے کہ بعض ہندوؤں کے ایک نعرے ''ہندی، ہندو، ہندوستان'' سے بھی ظاہر ہے۔ مسعود حسین خاں انیسویں صدی کے دوران میں ہندی اردو تنازع پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''۱۸۰۰ء سے کھڑی بولی ہندی کا چلن ہوا جو قومیت کی تحریک اور سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا تا آں کہ انیسویں صدی کے اواخر تک دونوں زبانوں کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ سرسید جیسے لوگ نہ صرف نئی قومیت کے تقاضوں پر انگشت بہ دنداں تھے، بلکہ ہندی کے دعووں پر سر بہ گریباں بھی۔ نئی امنگوں نے نئی مانگوں کو جنم دیا۔ جمہوریت نے اکثریت کی تائید کی۔ کچھ عرصہ تک 'ہندوستانی' سمجھوتے کی آڑ رہی، بالآخر عین اس وقت جب اردو اپنے بامِ عروج پر تھی، ہندوستان کی سب سے ترقی یافتہ زبان سمجھی جاتی تھی، ہندوستان کی واحد زبان تھی جو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ تھی— یہ ایک بہت بڑے سیاسی الٹ پھیر کی لپیٹ میں آ گئی۔ ۱۹۴۷ء میں دوٹوک فیصلے کا وقت آ گیا، ملک تقسیم ہوگیا، 'ہندوستانی' کی گدی ہندی کو مل گئی۔ ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے علاقوں کا تعین ہوگیا، اردو ''ہرجائی'' رہی۔'' (12)

تقسیمِ ملک کے بعد اردو پر کیا گذری، یہ مسعود حسین خاں کی زبانی سنیں۔ انھوں نے مایوسی کے عالم میں یہ تک کہہ دیا کہ ''ہندوستان میں اردو زوال کی راہ پر بھرپور قدم رکھ چکی ہے۔'':

''حیدرآباد کی ریاست کے ٹوٹتے ہی جامعۂ عثمانیہ مرحوم ہوگئی۔ اردو کا نظامِ تعلیم یوپی اور بہار جیسی آباد ریاستوں میں درہم برہم ہوگیا... نئی نسلیں اردو سے دور ہوتی گئیں۔ اردو کی لیڈری نامراد اور پلیڈری ناکام ثابت ہوتی گئی... ہمارے انتشار سے اغیار مسلسل فائدہ اٹھا رہے ہیں اور نئی نسلوں کی زبان بدلتے جا رہے ہیں۔ نئی نسل اردو سے 'بیگانہ آشنا' ہوتی جا رہی ہے... غرض کہ ہندوستان میں اردو زوال کی راہ پر بھرپور قدم رکھ چکی ہے۔ اس راہ سے باز گشت کے لیے زبردست تنظیم، عمل اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے، اس ایقان کے

ساتھ کہ مردہ زبانیں بھی زندہ ہوجاتی ہیں۔''(13)

اردو کو مسعود حسین خاں ایک تہذیبی قدر اور ضرورت تسلیم کرتے تھے جس کے بغیر، بقول ان کے، ''ہم گونگے، توتلے اور ہکلے'' ہوجائیں گے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں یہ بات کہی ہے کہ ''جب کسی سیاسی انقلاب کے تحت کوئی جماعت اپنی زبان کے ترک پر مجبور ہوجاتی ہے تو اس کی ذہنی موت کا آغاز ہوجاتا ہے، اس کی تہذیبی انفرادیت ختم ہونے لگتی ہے اور تخلیقی اعتبار سے وہ مفلوج ہوکر رہ جاتی ہے۔''(14) مسعود حسین خاں کے نزدیک ''زبان کی موت ایک گروہ کی تہذیبی موت سے عبارت ہے۔''(15) تقسیمِ ملک کے بعد کے حالات ہندوستان میں اردو کے لیے جان لیوا ثابت ہوئے۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اپنے مضمون ''اردو زبان: ایک تہذیبی روایت'' میں لکھتے ہیں:

> ''تقسیمِ ملک کے بعد حالات تیزی سے بدل گئے، اور اب زیادہ تیزی سے بدلتے جارہے ہیں۔ اسے مسلمانوں کی زبان کہا جارہا ہے (حالاں کہ حالات نے مسلمانوں کی نئی نسل کو بھی مجبور کردیا ہے کہ وہ اسے نہ سیکھ سکیں)۔ بہرحال اب یہ ایک لسانی اقلیت کی زبان ہے جس کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جارہا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ایک زندہ حقیقت بن کر ہندوستان میں رہے گی یا تاریخ کے ایک دور کی سنہری یاد ہو کر رہ جائے گی۔''(16)

اردو کی حیثیت پہلے کیا تھی، اس پر بھی مسعود حسین خاں نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان ... ایک ایسی لسانی روایت کی حامل رہی ہے جسے کم از کم ہنگامۂ ۱۸۵۷ء تک بلا امتیازِ مذہب وملت شمالی ہند میں سب تسلیم کرتے تھے۔ یہ نہ ہندو تھی نہ مسلمان، سب کی تھی۔ اس میں دیا شنکر نسیم، چکبست، سرور جہان آبادی اور بے شمار چھوٹے موٹے شاعروں نے نغمہ سرائی کی اور اس کے افسانوی ادب پر تو بیسویں صدی تک غیر مسلم چھائے رہے۔''(17)

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ تقسیم ملک کے وقت انجمن ترقی اردو پر بھی زد پڑی اور اس کا شیرازہ پورے طور پر بکھر گیا، لیکن انجمن ترقی اردو (ہند) کی شکل میں یہ فعال بن کر پھر سے ابھری اور اردو تحریک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اردو کو اس کا دستوری و جمہوری حق دلوانے کے لیے انجمن ترقی اردو (ہند) کی 1951 میں جس تحریک کا بڑے پیمانے پر آغاز ہوا تھا اس کے پسِ پشت مسعود حسین خاں ہی کی ذہنیت کام کررہی تھی۔(18) انھوں نے ہی رشید احمد صدیقی کو دستورِ ہند کی دفعہ 347 کی تفصیلات بتائی تھیں کہ اسی دفعہ 347 کے تحت صدر جمہوریہ کی ہدایت پر اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی نے جو انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے ایک رکن تھے بہار ریاستی اردو کانفرنس کے پٹنہ اجلاس میں 12 مئی 1951 کو اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پہلی بار محبانِ اردو کی توجہ دفعہ 347 کی جانب مبذول کرائی اور یہیں سے اردو کی علاقائی زبان کی تحریک کا آغاز ہوا جس کا قدرے تفصیل سے ذکر اوپر آچکا ہے۔

چوں کہ تقسیمِ ملک کے بعد یوپی میں اردو نظامِ تعلیم کا

شیرازہ بکھر چکا تھا اور سرکاری اسکولوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کو ختم کر دیا گیا تھا، اس لیے مسعود حسین خاں نے اس کے خلاف مہم چھیڑی اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ فلسفۂ تعلیم کے اس مسلمے سے واقف تھے کہ بچے کی کم از کم ابتدائی تعلیم، تمام تر اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ مادری زبان ان کے نزدیک ''وہ زبان ہے جس سے کسی گروہ کے بچے کا سابقہ زیادہ مدت تک اور اس کے ذہن کی تشکیل کے وقت مسلسل رہتا ہے۔ وہ نہ صرف ابتدا سے اس کے لیے خارجی ماحول کے علم کا وسیلہ ہوتی ہے، بلکہ اس کے تخیل کے لیے جولاں گاہ اور جذبات کی پرورش گاہ بھی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کوئی دوسری زبان . . . اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔''(19) مسعود حسین خاں دوسری زبانوں کے خلاف نہیں تھے۔ ان کا قول ہے، ''دوسری زبانوں کا مقام درجہ بدرجہ اپنی جگہ پر آتا ہے۔'' ان کے خیال کے مطابق ''اردو میڈیم کے ابتدائی اسکولوں میں ہندی تیسرے درجے سے شروع کی جاسکتی ہے (ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے نہیں)، لیکن انگریزی کو پانچویں یا چھٹے درجے سے پہلے شروع کر دینا بچے کے ذہنی ارتقا میں خلل اندازی کے مترادف ہوگا۔''(20)

اردو نظامِ تعلیم کو عملی شکل دینے کے لیے مسعود حسین خاں نے بتدریج حسبِ ذیل امور پر عمل پیرا ہونا ضروری قرار دیا ہے:(21)

1- سب سے پہلے ایسے اضلاع اور مراکز کی فہرست تیار کرلی جائے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کافی ہو۔

2- اردو ذریعۂ تعلیم کے ابتدائی سرکاری اسکول ہر اس گاؤں اور شہر میں قائم کیے جائیں جہاں اردو پڑھنے والے بچے موجود ہوں، کیوں کہ ''مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا ان کا دستوری حق ہے۔''

3- ثانوی اور اعلیٰ سطحی ثانوی اسکول منتخب مقامات پر قائم کیے جائیں، لیکن ان کا رابطہ ابتدائی سطح کے اسکولوں سے ضرور ہو۔

4- ان ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے منتظمین اردو داں حضرات ہوں۔

5- اردو ذریعۂ تعلیم کے ان اداروں میں تربیت یافتہ اساتذہ کا ہونا ضروری ہے۔ سرکاری سطح پر ان اساتذہ کو اردو تدریس کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ جس طرح کہ ہندی اور دوسری زبانوں کے اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے۔

6- اردو کی درسی کتب کی تیاری کا کام بھی سرکاری سطح پر کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے نجی ادارے بھی اس کام کو کرسکتے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ''اردو کو زبان کے منصب پر فائز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نظامِ تعلیم کی ابتدائی مدارج سے یونیورسٹی کی سطح تک تنظیم کی جائے۔'' ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''اردو یونیورسٹی خلا میں قائم نہیں کی جاسکتی۔ اردو یونیورسٹی قائم کرنے سے قبل اردو اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھنا ضروری ہے۔''(22)

مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مضمون ''اردو کا محضرنامہ'' میں دو ٹوک انداز میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ اردو کو اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، میسور اور دہلی میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ دوسری سرکاری زبان ہوجانے کے بعد ہی ان ریاستوں میں اردو کے متوازی نظامِ تعلیم کی قانونی مانگ پیش کی جاسکتی ہے۔(23) مسعود حسین خاں نے ہمیشہ ان بچوں کے لیے جن کی مادری

زبان اردو ہے، اردو ذریعۂ تعلیم کی وکالت کی ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہندی یا کسی دوسری زبان کے خلاف تھے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا ہے:

''ہندی یا ہندی والوں سے ہمارا کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ہندی، ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ ہمارے لیے رابطے کی زبان کا حکم رکھے گی، لیکن مادری زبان کا نہیں۔''(24)

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا:

''اردو ہندی کی حریف نہیں، حلیف ہے۔ دونوں ایک مشترک بولی کی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہوئے بھی مختلف زبانیں ہیں۔ اردو، اردو والوں کے وجود کے لیے اسی قدر اہم ہے جس قدر کہ ہندی، ہندی والوں کے لیے۔''(25)

انھیں اس بات کا شکوہ ضرور تھا کہ ہندی نے اردو کو اس کے گھر میں ''بے گھر'' کر دیا ہے۔ وہ اپنے ایک اداریے ''اردو بنام ہندی'' میں لکھتے ہیں:

''بالآخر آزادی کے ساتھ ہندی بصد ناز آئی اور اردو کو ہندی کی ''دشیلی'' کہہ کر اس کے گھر میں بے گھر کر دیا گیا۔''(26)

وہ اردو کے مستقبل کے بارے میں خاصے مایوس ہوگئے تھے، چنانچہ ایک دوسرے اداریے ''زبانوں کا عروج و زوال'' میں لکھتے ہیں:

''غرض کہ ہندوستان میں اردو زوال کی راہ پر بھرپور قدم رکھ چکی ہے۔ اس راہ سے بازگشت کے لیے زبردست تنظیم، عمل اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے، اس ایقان کے ساتھ کہ مردہ زبانیں بھی زندہ ہوجاتی ہیں۔''(27)

ایک اور موقع پر انھوں نے لکھا:

''غرض کہ اردو کی موت تہذیب کے ایک تصور کی موت ہوگی، ہندوستانی تاریخ کے ایک دور کی موت ہوگی، یہ ہندوستانی قومیت کے ایک جاندار حصے کی بھی موت ہوگی، اس لیے ہندوستانی قومیت اور اس کی رنگارنگی کا عین تقاضا ہے کہ یہ لسانی اقلیت اپنی انفرادیت کی تلاش نا مساعد حالات میں بھی جاری رکھے!''(28)

مسعود حسین خاں نے اردو تحریک کو ایک نیا رُخ اس وقت دیا جب ہندوستان میں نئی مردم شماری کا وقت آیا۔ انھوں نے برملا یہ اعلان کیا کہ ''مردم شماری کو اصطلاحاً سرشماری بھی کہا گیا ہے۔ یاد رکھیے کہ جو سرشمار نہیں ہوگا، وہ قلم ہوگا، اس لیے اردو بولنے والوں کا فرض ہے کہ وہ مادری زبان کے خانے میں اردو لکھوائیں۔''(29) مردم شماری کے سلسلے میں سرکاری عملہ اکثر دھاندلے بازی سے کام لیتا ہے اور جان بوجھ کر غلط اندراج کر دیتا ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مسعود حسین خاں محبانِ اردو کو ان کی ذمے داری کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مردم شماری کا سرکاری ہرکارہ اپنے قلم سے اس خانے [زبان کے خانے] کو غلط بھر دے تو اسے ٹھیک کرائیں۔ مادری زبان کے لکھنے میں دھاندلبازی کرنے کا

موقع گانووں کی آبادی میں زیادہ ملتا ہے، اس لیے جولوگ قصبات اور شہروں کے رہنے والے ہیں وہ اپنے اپنے علاقوں کے دیہات کا دورہ کرکے وہاں کی کم پڑھ آبادی کو مادری زبان اور اس کے بولنے والوں کی تعداد کے صحیح اندراج کی اہمیت کے بارے میں بتائیں۔ اس کے لیے گاؤں، قصبات اور ضلع کی سطح پر اردو کمیٹیوں کی تشکیل ضروری ہے۔''(30)

مسعود حسین خاں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مردم شماری کے زمانے میں اردو کے سلسلے میں اصل کام دیہی علاقوں میں کرنے کا ہے ''جہاں اردو، ہندی کو ایک زبان کہہ کر بہکایا جاسکتا ہے۔'' انھوں نے اپنے مضمون ''نئی مردم شماری'' کے توسط سے بحیثیتِ شیخ الجامعہ، جامعۂ اردو کے تمام مہتممینِ مراکز اور اس کے طلبائے قدیم سے یہ اپیل کی کہ ''وہ اپنے اپنے حلقوں میں اردو کا مادری زبان کی حیثیت سے صحیح اندراج کرانے میں پیش قدمی کریں اور اس ادارے [جامعۂ اردو، علی گڑھ] کے حقِ خدمت کو اس طرح ادا کریں۔''(31)

ہمارے ملک میں ہر پانچ سال بعد بڑے پیمانے پر انتخابات ہوتے ہیں، چنانچہ یہ ایسا موقع ہوتا ہے جب سیاسی جماعتیں ووٹ دہندگان کو لبھانے کے لیے ہر قسم کے وعدے کرتی ہیں۔ مسعود حسین خاں کا قلم اس موقع پر بھی اردو والوں میں حرارت پیدا کرنے کے لیے فعال ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''اردو اور الکشن'' میں لکھتے ہیں کہ ''یہ موقع عہدِ وفا باندھنے کا نہیں، مصلحت اور حکمت کا ہے''، یعنی اردو والوں کو اس موقع پر سیاسی پارٹیوں سے سودے بازی کرنا چاہیے کہ انھیں ووٹ تبھی ملیں گے جب وہ اردو کو اس کا حق دلوائیں گے، ع

کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے(32)

مسعود حسین خاں کا عقیدہ ہے کہ اردو، اردو والوں کے لیے ایک تہذیبی قدر کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا محفوظ رکھنا اس ملک کے سیکولر کردار کے لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ 'ہندلمانی' (ہندو+مسلمانی) تہذیب کا ایک عظیم ورثہ ہے، نیز اس کی اپنی پہچان اور انفرادیت ہے۔ اس لیے جیسا کہ ان کا خیال ہے، الکشن کے موقع پر اردو والوں کا ''سیاسی پروگرام'' صرف ایک ہونا چاہیے یعنی ''اس زبان کو اس کا حق دلوانا، کہیں مراعات کی شکل میں اور کہیں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے۔''(33)

بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں جن علمی وادبی شخصیتوں نے اردو تحریک کو جِلا بخشی ان میں مسعود حسین خاں کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے ہر محاذ پر اردو کی لڑائی لڑی۔ ان کا قلم اردو کے دستوری و جمہوری حقوق کو منوانے کے لیے ہمیشہ رواں دواں رہا۔ رشید احمد صدیقی نے مسعود حسین خاں کو بجا طور پر ''ان چند (چند سے بھی کم)'' لوگوں میں شمار کیا جو ہندوستان میں اُن دنوں اردو کے ''بہترین وکیل اور سفیر'' کہے جاسکتے تھے۔

☆☆☆

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔ جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

ظفر کمالی

مضمون

مجتبیٰ حسین ایک اثر

معزز حاضرین مجلس! سب سے پہلے مجھے اقرار کر لینے دیجئے کہ میں نہ مجتبیٰ حسین کا دوست ہوں اور نہ وہ میرے روایتی دیرینہ بزرگ ہیں۔ چند مختصر ملاقاتوں اور موبائل سے گفتگو کے علاوہ نہ میں نہ انھیں قریب سے دیکھا اور نہ انھیں جاننے کے لیے ادبی سراغ رسانی کا فریضہ انجام دیا۔ سوال یہ ہے کہ پھر ان کی شخصیت پر اظہار خیال کیسے کر سکتا ہوں۔ اس کا سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ جب لوگ سفر کے بغیر سفرنامے لکھ سکتے ہیں، ادب پارے کی تفہیم سے عاری حضرات پائے کے نقاد بن سکتے ہیں، قافیہ ردیف سمجھے بغیر شاعری ہو سکتی ہے، نظم کے نام پر نثر لکھی جا سکتی ہے تو پھر کسی کی شخصیت پر خامہ فرسائی کے لیے اسے اچھی طرح جاننا کیا ضروری ہے۔ ویسے بھی اردو میں لکھنے والے دیدہ ور کم دیدہ دلیر زیادہ ہیں۔ آج یہ خاکسار دیدہ دلیری کی اسی مروجہ روش سے فیض اٹھا لے تو بھلا کون ہی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

یدا بخیر! مجتبیٰ حسین صاحب کے نام سے میری باضابطہ شناسائی کنھیا لال کپور پر لکھے ان کے خاکے کے ذریعے ہوئی۔ ۱۹۸۱ء میں جب ان کے خاکوں کا مجموعہ ''آدمی نامہ'' چھپا تو اس کی دھوم مچ گئی۔ میں نے بھی حیدر آباد سے کتاب منگوائی۔ اس میں پندرہ ادیبوں اور شاعروں کے خاکے پڑھ کر عجیب سی حیرانی ہوئی۔ اس وقت میں بی اے کا طالب علم تھا۔ استاذی احمد جمال پاشا سے دریافت کیا تو انھوں نے ان کی تعریفوں کے وہ پل باندھے کہ مت پوچھئے۔ فن کاروں میں تو پیشہ ورانہ قابت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں ایسے ایسے بلکہ ایسے ویسے ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں جو اپنے کو ایسا آفاقی فن کار سمجھتے ہیں جن کی دنیا نے قدر نہیں کی۔ ایسی حالت میں ایک مزاح نگار سے اپنے ہم عصر مزاح نگار کی تعریف سن کر حیرت کا ہونا فطری تھا۔ بہر حال! دل کو اتنا تو یقین ہو گیا کہ یہ حضرت کوئی اونچی قسم کی چیز ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات ان کے نام سے آشنائی کے بیس برسوں بعد دہلی میں ان کے گھر پر ہوئی جہاں میں اظہار ندیم کے ساتھ گیا تھا۔ اس پہلی ملاقات میں وہ جس اپنائیت کے ساتھ ملے اس کا نقش ہنوز دل پر قایم ہے۔ انھوں نے حسن چشتی کی مرتبہ کتاب ''مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں'' کی جلد اول اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کی اور اپنی پرخلوص گفتگو سے بے حد حوصلہ افزائی فرمائی۔ انھوں نے ہم لوگوں کی آمد کی اطلاع مظہر امام صاحب کو بھی دے دی تھی۔ وہیں ان کا فون بھی آیا کہ میں آپ لوگوں سے ملنے کا منتظر ہوں۔ مجھے جیسے تو وارد ادب کے تئیں ان کا یہ مشفقانہ رویہ خاصا تعجب خیز تھا۔ ان سے رخصت ہوتے وقت حالؔی کا مصرع بہت یاد آیا کہ ابھی کچھ لوگ ہیں باقی جہاں میں۔

ہمارے بڑے بہنوئی ڈاکٹر خورشید عالم مرحوم مجتبیٰ صاحب کی تحریروں کے ناقابل علاج عاشق تھے۔ انھوں نے ان کی تکابوں کا پورا سیٹ منگوا رکھا تھا۔ وہ اپنے اینٹ بھٹے پر بیٹھے یہ کتابیں پڑھتے رہتے۔ مجھے جب بھی فون کرتے دو ایک جملوں میں خیریت دریافت کر کے کسی نہ کسی بہانے مجتبیٰ صاحب کی تحریریں سنانے لگتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں صبح کا ناشتہ کر رہا ہوں کہ ادھر سے فون آیا کہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' سے یونیسکو کی چھتری والا حصہ سن لو۔ میں کہتا کہ میں پڑھ چکا ہوں لیکن وہ اصرار کرتے کہ نہیں مجھ سے سنو۔ مرحوم مضمون کم سناتے اور قہقہے زیادہ لگاتے تھے۔ مجھے کالج جانے کی دیر ہو رہی ہوتی لیکن ان کے قہقہوں کے لا متناہی سلسلے سے نجات ملنی مشکل تھی۔ کبھی کبھی مجھے ان سے زیادہ مجتبیٰ صاحب پر غصہ آتا کہ وہ تو آرام سے دہلی میں بیٹھے ہیں اور میں

فون سے کبھی ''ڈائریکٹر کا کتا'' کبھی ''قصہ داڑھ کے درد کا'' اور کبھی ''ریلوے منتری مسافر بن گئے'' زبردستی سننے کے لیے مجبور ہوں۔ ایک مرتبہ تو حد ہی ہوگئی۔ میں اپنے کسی عزیز دوست کے یہاں تہنیتی تقریب میں شرکت کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ حسب سابق مرحوم کا فون آیا کہ ارے ارے تہنیتی تقریب میں جانے سے پہلے ''تعزیتی جلسے'' سنتے جاؤ۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پون گھنٹے تک تعزیت کے بہانے ان کی ہنسی سنتا رہا۔ اس وقت بے اختیار یہی جی چاہتا تھا کہ کاش! کوئی میرا ہی تعزیتی جلسہ کر دیتا تو یہ روز روز کی مصیبت سے نجات مل جاتی۔ مجتبیٰ صاحب نے کسی جگہ لکھا ہے کہ امریکہ کے ہاتھ ہمارے باورچی خانوں تک پہنچ چکے ہیں لین حضرت کو کیا خبر کہ ان کے مضامین شہری حدود سے نکل کر دیہات کے اینٹ بھٹوں تک جا پہنچے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی مقبولیت نے محبوبیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اسی پچاسی کی عمر میں محبوب بننا کسے اچھا نہیں لگتا۔

مجتبیٰ حسین بچپن سے ہی شوخ مزاج رہے ہیں لیکن ''سقوطِ حیدرآباد'' کے زمانے میں انھوں نے بڑے دل دوز مناظر دیکھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے ماموں اور پھوپھا کا قتل ہوا۔ ان حادثات نے ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ شدید باطنی اضطراب کا شکار ہو گئے۔ ذہنی بے سکونی اور ریاست نے انھیں اپنا اسیر بنا لیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو کالج کی زندگی نے انھیں بہت ذہنی سنبھالا دیا۔ اپنی شعوری کوششوں سے قنوطیت کے حصار سے باہر نکلنے میں جب وہ کامیاب ہو گئے تو ان کی فطری زندہ دلی پھر بیدار ہوگئی اور انھوں نے دوستوں کے ساتھ مل کر جی بھر کر شرارتیں کیں۔ دراصل وہ کبھی نچلے بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی رگوں میں چہکتا ہوا لہو ہمیشہ موجیں مارتا رہا۔ نوجوانی کی انھیں شرارتوں نے جب ادبی شائستگی کا لبادہ اوڑھا تو اردو کو ایک بہترین مزاح نگار ملا۔ اردو دنیا کو ان کے برادر بزرگ جناب محبوب حسین جگر کا احسان مند ہونا چاہیے جن کیا جوہر شناس نظروں نے انھیں کالم نگاری کیا جانب مائل کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید مجتبیٰ صاحب صحافی ہوتے ظرافت نگار نہیں۔

مجتبیٰ صاحب بڑے باخبر انسان ہیں۔ ہزاروں کی گھریلو زندگی کی انھیں واقفیت ہے۔ ادبی دنیا کے داؤ پیچ اور سازشوں کی پل پل کی خبریں ان تک پہنچتی رہتیہیں۔ وہ دوستوں اور دشمنوں کے راز ہائے سربستہ سے اس طرح واقف رہتے ہیں جیسے سی بی آئی انھیں کے قبضے میں ہو۔ ان کی فطرت میں تجسس کا جو مادہ ہے اسی کی بدولت وہ لوگوں کی گھریلو زندگی سے لے کر عالمی مسائل تک کا یکساں عرفان رکھتے ہیں۔ ان کی باخبری، ان کے سوچتے ہوئے ذہن اور تیز ہیں نظر کا ہی کرشمہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بصارت سے زیادہ بصیرت کی کارفرمائی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

وہ تقریباً تین دہائیوں تک دہلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا سرگرم حصہ بنے رہے۔ ان کے باغ و بہار قلم نے پوری دہلی کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ شہر کی کوئی بھی ادبی تقریب ان کے خاکوں کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی رہی۔ ''چہرہ در چہرہ'' کے دیباچے میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

''مجھ ناچیز پر ایک دور ایسا بھی گزر چکا ہے جب حیدرآباد اور دہلی کے کسی ادیب یا شاعر کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ میں صاحب کتاب کا خاکہ نہ پڑھوں۔ کسی شاعری کا جشن منایا جاتا تو میرا خاکہ جشن کے تابوت میں آخری کیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔''

اپنے زورِ قلم سے مجتبیٰ حسین نے کتنے کرداروں کو زندگی بخش دی۔ ادب کے جہانیاں جہاں گشت بن کر انھوں نے ایک عالم کی سیر کی اور وہاں کے تجربات و مشاہدات کو کھٹی میٹھی یادوں کو قمل بند فرما کر مزاحیہ سفرناموں کی اس روایت کو توانائی اور وسعت بخشی جو ان انشا اور کرنل محمد خاں سے مخصوص تھی۔

ان کی شخصیت کے مختلف روپ ہیں ۔وہ بزرگوں کا احترام کرنے والے بھی ہیں اور خرد نواز بھی۔ وہ متواضع ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت منکسر المزاج ہیں۔تعلقات نبھانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔رشتوں کا پاس ولحاظ کوئی مجتبیٰ صاحب سے سیکھے۔ یہ رشتے خواہ خاندانی ہوں یا ادبی و معارتی ،ایسا لگتا ہے اللہ نے انھیں خصوصی طور پر اسی کے لیے پیدا کیا۔آج رشتوں کی جڑیں جس طرح کٹ رہی ہیں،لوگوں کا خاندانی دائرہ سمٹتے سمٹتے بیوی بچوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے،اس سے کون واقف نہیں۔ایسے میں مجتبیٰ صاحب اپنے عزیزوں اور احباب کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کا خیال جس طرح رکھتے ہیں وہ حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ مجھے ان کے نام آئے ہوئے خطوط کو ترتیب دینے کا شرف حاصل ہے۔ان خطوط میں ان سے کی گئی فرمایش قابل دید ہیں۔تعلیم گاہوں میں داخلے اور مقابلہ جاتی امتحانوں کا فارم بھیجنا،کتاب کے مسودے مالی امداد کے لیے داخل کرنا ،شائع شدہ کتابوں پر انعامات اور تھوک خریداری کے لیے فارم کی طلب،ٹھہرنے کے لیے ہوٹل بک کرانا یا گیسٹ ہاوس کا انتظام،ریل روز رویشن اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ بکر کرانا، پاسپورٹ فارم حاصل کرنا، ویزے دلوانا ، رشتے طے کرنا، نوکری دلوانا،اعزاز واکرام کے لیے سفارش کرنا،تبادلے کرانا،جگہ جائیداد کا تصفیہ کرنا،دوستوں کے آپسی جھگڑے سلجھانا،مختلف طرح کے بلوں کی ادائیگی کگانا،گیس کے چولھے دلوانا ادبی اسکیموں کو منظوری دلوانا، ادبی تقریبات کے معاوضے میں اضافہ کرانا، نئے اور پرانے شاعروں کی کتابوں کا جشن اجرا کرانا، ریڈیو سیٹ ٹھیک کرانا،داڑھ کے درد میں لوگوں کو ڈینٹل سرجن کے یہاں لے جانا، وزیروں سے سفارش اور نہ جانے کتنی طرح کی فرمائشیں۔ یہ وہ فرمائشیں ہیں جنھیں وہ تواتر کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔ان کے خدمت خلق کے جذبے کو سمجھنا ہو تو فکر تونسوی کا مضمون ''مجتبیٰ بھائی فکر بھائی مزاج والے'' پڑھ لیجئے بہت کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ میرا محتاط انداز ہ یہ ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس کے گھروں کی سبزی ترکاری اور سودا سُلف بھی ضرور لاتے ہوں گے۔اپنے گھر کا آٹا تو وہ پسواتے ہی تھے۔ آپ مسکرائیں نہیں، یہ تو قرون اولیٰ کے مسلمانوں وار اللہ والوں کا خاصا رہا ہے۔خلق خدا کے کام آنا مجتبیٰ حسین کا محبوب مشغلہ ہے۔آپ انھیں آج بھی کوئی کام سونپ دیجئے یا صرف کام کا تذکرہ کر دیجئے ان کے تعلقات اتنے وسیع ہیں کہ وہ گھر بیٹھے بیٹھے سارا انتظام کر دیں گے۔ وہ آپ کے مسئلے کو صرف اپنا ہی نہیں بلکہ اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مجھے ویلور میں اپنے بیٹے کے داخلے کا مسئلہ درپیش ہوا تو انھوں نے سنتے ہی مسئلہ یہاں تک حل کیا کہ ویلور ریلوے اسٹیشن پر مجھے کون ریسیو کرے گا، میں کہاں ٹھہروں گا ،کون داخلہ کرائے گا،میری ملاقات کن حضرات سے ہوگی، اسٹیشن پر مجھے نے کون آئے گا وغیرہ۔ دوسروں کے مسائل کو اپنے مسائل کی طرح حل کرنا ایک طرح سے ان کی ہابی ہے۔

تہذیبی قدروں اور رشتوں کا یہ احترام ہی ہے کہ جب ان کے بچوں کی شادیاں ہوئیں تو دعوت نامے ان کے بڑے بھائی جناب محبوب حسین جگر کی طرف سے چھپے۔ بہ ظاہر اس طرح کی چھوٹی چھوٹی لیکن بے حد اہم باتوں کا خیال کتنے لوگ رکھتے ہیں۔ خدمت خلق کا جذبہ ان کے خاندان کا وتیرہ رہا ہے۔ان کے دو بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس تا عمر اپنے معاشرے کے لیے ہی جیے اور اسی کے لیے مرے۔جگر صاحب نے تو اسی کے چلتے شادی تک نہیں کی۔مجتبیٰ حسین اسی خاندان کے فرد فرید ہیں اور اس تابناک روایت کو اپنی کوششوں سے مزید روشن کر رہے ہیں۔

قدیم حیدرآبادی تہذیب کے پروردہ مجتبیٰ حسین بے حد جذباتی شخصیت کے حامل ہیں۔ جذباتی لوگوں کا خلوص شک و شبہے سے بالا تر ہوتا ہے۔مجتبیٰ صاحب کے پُر خلوص جذبات کا

اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لگا تار ستائیس برسوں تک جس اسکوٹر پر بیٹھ کر مختلف دفاتر اور شہر دہلی کی گلیوں کا چکّر لگاتے رہے، جب دہلی سرکار نے یہ فرمان جاری کیا کہ وہاں کی سڑکوں پر پندرہ سال پرانی گاڑیاں نہیں چلیں گی تو انھوں نے اسکوٹر کو بیچنے کے بجائے حیدرآباد بھجوانا پسند کیا تکہ وہ محفوظ رہ سکے۔اس کی مفارقت کسی حال میں بھی ان کو گوارا نہ ہوسکی۔ستائیس برسوں میں ہوان کے لیے ایک جیتے جاگتے فرد کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ جس کے جذبات اسکوٹر سے اس طرح جڑے ہوں، انسانوں کے ساتھ اس کی وابستگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔اسکوٹر کی بات آئی تو یہ بھی سنتے چلیں کہ یہ وہ اسکوٹر ہے جس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اٹل بہاری واجپئی، اندر کمار گجرال، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ایم۔ایف حسین اور پاکستانی گلوکار غلام علی کیعلاوہ سیکڑوں دیگر مشہور ادیب و شاعر، آرٹسٹ، بڑے افسران اور ممبران پارلیمنٹ نے اس کی زینت بڑھائی اور دہلی کی سر کی۔ پورے ہندوستان میں اگر ایسی تاریخی اسکوٹر کہیں اور ہو تو کوئی ہمیں بتائے۔اسے تو کسی میوزیم کی زینت ہونا چاہیے۔سالار جنگ میوزیم کے ذمے داران اس کی جانب کب متوجہ ہوں گے۔

مجتبیٰ صاحب نے اگر اپنے احباب اور متعلقین کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تو لوگوں نے بھی ٹوٹ کر ان سے پیار کیا۔ان کے دوستوں میں سے دانستہ طور پر کسی نے ان کو تکلیف پہنچا دی تو فوراً پشیمان ہوا۔ان کی ناراضگی اس شخص کے لیے سوہان روح ہو جاتی تھی۔مشہور شاعر شہریار سے ایسی ہی چوک ہوئی تو انھوں نے علی گڑھ سے فوراً معذرت نامہ بھیجا جس میں یہ لکھا کہ ''دہلی کا ہر سفر انے اوپر اس وقت تک کے لیے بند کرتا ہوں جب تک آپ کی طرف سے پروانہ معافی موصول نہیں ہو جاتا۔دہلی کا دروازہ ہم پر کھلے گا تو آپ کے حکم سے''۔

مجتبیٰ صاحب سے فون سے گفتگو کیجئے تو ان کے اندر تخاطب سے ہی ان کے پُر خلوص جذبات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں نے ادھر سے ہیلو کہا ادھر سے فوراً آواز آئی ''السلام علیکم! کیسے ہیں، کیسے ہیں، کیسے ہیں ظفر صاحب آپ کیسے ہیں؟'' گویا ایک بار'' کیسے ہیں'' کہنے سے ان کے جذبے کی تسکین نہیں ہوتی وہ بار بار اسے دہرا کر منتہاے خیریت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ان کی آواز اور لہجے میں جو اپنائیت ہوتی ہے اس کا احساس اس کو ہوسکتا ہے جس نے دل کے کانوں سے اسے سنا ہو۔میں نے استاذی احمد جمال پاشا کے بعد محبت کی۔ یہ جھلک انھیں کی ذات میں دیکھی اسی وجہ سے یہ نام اور یہ آواز آج میرے لیے کسی فرحت فرزا اور حیات بخش جام سے کم نہیں۔

مجتبیٰ صاحب کے کردار کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا ورنہ زمانہ تو یہ صورت حال ہے کہ جن کے پاس ضمیر نہیں وہ اپنی بے ضمیری کے سودے کے لیے ہی ہمہ دم تیار رہتے ہیں۔مجتبیٰ صاحب کے تعلقات کا دائرہ وسیع ہے۔دو دو وزرائے اعظم، کئی وزیر اعلیٰ، کتنے مرکزی وزیروں، کیسے کیسے اعلا افسروں اور بیوروکریٹ حضرات سے ان کے روابط رہے لیکن اپنے ذاتی فائدے کے لیے انھوں نے تعلقات کے استعمال سے حتی الامکان گریز کیا۔وہ انعام واکرام کے پیچھے کبھی نہیں دوڑے۔اپنے ظریفانہ لہجے میں وہ کہتے ہیں کہ:

''ہم کبھی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگے۔جس عمر میں جس کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت پیش آئی ضرور بھاگتے رہے''۔

یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ جب انھیں پہلا غالب ایوارڈ برائے طنز ومزاح دینے کا اعلان ہوتو انھوں نے یوسف ناظم اور فکر تونسوی کے رہتے ہوئے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔فکر تونسوی نے ہی آگے بڑھ کر اسے قبول کرنے کے لیے انھیں مجبور کیا تھا۔ایک خاص تہذیب کا پروردہ انسان ہی ایسا کر سکتا ہے۔

ہمارے مجتبیٰ صاحب طالب علمی کے زمانے میں

اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے تہذیبی پروگراموں کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ اگر وہ گلوکاری یا اداکاری کے میدان میں ہی قسمت آزمائی کرتے تو آج کیا ہوتے اور کہاں ہوتے۔ ظاہر ہے اداکاری میں وہ شاہ رخ یا سلمان خان تو ہو نہیں سکتے تھے۔ تصور کی آنکھ سے انھیں اسٹیج پر بیٹھے راگ الاپتے اور یکا گانا گاتے ہوئے دیکھتا اور سنتا ہوں تو دل میں بہ یک وقت ظرافت کی ہزاروں پھل جھڑیاں چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔

ان کی معصوم فطرت کا چلبلا پن آج بھی قایم ہے۔ مجلسی گفتگو کے علاوہ لطائف وظرائف میں کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ علم سینہ سے تعلق رکھنے والے لطائف کا خزانہ بھی ان کے پاس موجود ہے۔ وہ ٹیلی فونی گفتگو میں بھی بے ساختہ انداز میں ایسے ایسے لطیفے سنا دیتے ہیں کہ بعض اوقات پر ہیڑ گاری کی تجدید وضو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کمال در کمال یہ ہ کہ ایسی حالت میں بھی ان کے ہاتھوں سے شائستگی کا دامن نہیں چھوٹتا۔ مجتبیٰ صاحب نے اپنی تحریروں میں لطائف سے بھی بہت کام لیا ہے۔ لیکن ان کے یہاں یہ لطیفے پیوند کاری نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کے مضامین کا جزو بن جاتے ہیں۔

مجتبیٰ صاحب اکثر اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو کبھی مزاح نگار نہیں سمجھا۔ وہ یہ بات بر بنائے انکسار نہیں کہتے بلکہ کبھی کبھی قسمیں کھا کر اس کا یقین دلاتے ہیں۔ اگر واقعی ان کا یہی خیال ہو کہ وہ ظرافت نگار نہیں تو ان سے زیادہ یہ کون سمجھ سکتا ہے کہ حاسدین تو ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ وہ ان کی سچی خاکساری کو سچ سمجھ کر اس کی تشہیر کریں اور بہ طور حوالہ ان کے مستند قول کو ہی استعمال کرنے لگیں تو پھر بڑی پیچیدہ صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا خاکسار بڑے ادب سے عرض کرنا چاہتا ہے کہ آپ بھلے ہی اپنے کو مزاح نگار نہ سمجھیں لیکن اس کا تذکرہ بھری بزم میں ہرگز ہرگز نہ کریں کہ اس میں خطرے بہت ہیں اور خطرات سے کھیلنا جواں مردوں کا کام سہی لیکن دانش مندوں کو اس سے گریز کرنا ہی مناسب ہے۔ ویسے یہ کون نہیں جانتا کہ آج مجتبیٰ حسین اردو طرافت کے محور بن چکے ہیں۔ کم از کم ہندوستان کی ظرافت اب انہیں کے اردگرد رقصاں ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے بجا طور پر انھیں طنز و مزاح کا سفیر کہا ہے جن کے ذریعے اردو کا مزاحیہ ادب اجنبی دیاروں تک جا پہنچا۔

مجتبیٰ حسین کی تحریریں سہل ممتنع کے شعر جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی تقلید آسان نہیں۔ ان کے لہجے کی نقل خاص طور سے دشوار ہے۔ ان کے فقرے نثر کے ''مصرعہ تر'' ہیں جن کے لیے بقول شاعر سیروں لہو خشک کرنا ہوتا ہے۔ وہ پڑھتے بھی سادہ انداز میں ہیں لیکن ان کے مضامین ہوں یا خاکے یا کوئی اور طرح کی تحریر، وہ بذات خود اتنی دل چسپ ہوتی ہے کہ سامعین کے دل کو فوراً مسحور کر لیتی ہے۔ پٹنہ کی ایک محفل میں جب انھوں نے گورنر بہار دیوانند کنور کی موجودگی میں اپنا مضمون ''صاحب باتھ روم میں ہیں'' سنایا تو گورنر صاحب بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ مجھے تو گونر صاحب کے عملے کی معنی خیز مسکراہٹ بھلائے نہیں بھولتی۔ وہ تو محرم راز درونِ خانہ تھے، نہ معلوم ان کے ذہن میں اس وقت صاحب اور ان کے باتھ روم کی کیسی کیسی تصویریں گھوم رہی ہوں گی۔ مجتبیٰ حسین کے یہاں المیہ اور طربیہ آپس میں مدغم ہو گئے ہیں۔ ہنساتے ہنساتے رلانا اور رلاتے رلاتے ہنسانا ان کا خصوصی امتیاز ہے۔ یہ حزنیہ نشاط اور ایسی دردمندانہ ہنسی کی فضا خلق کرنے کے لیے فن کار کو کرب کی جس شدت سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ ہی کر سکتا ہے جو زندگی کا سچا عرفان رکھتا ہو۔

جہاں تک مجتبیٰ صاحب کے مضامین، کالم اور دیگر تحریروں کا تعلق ہے، ان کا منتخب حصہ ہی اب تک کتابی صورت میں سامنے آ سکا ہے۔ ابھی ان کی تحریروں کی کئی ضخیم جلدیں شائع ہو سکتی ہیں جو بکھری ہوئی ہیں۔ دراصل مجتبیٰ صاحب فنی عظمت کی اس

بلندی پر فائز ہو چکے ہیں جب فن کار کی تحریر وتقریر کا ہر لفظ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے لہٰذا ان کی تمام غیر مدون تحریروں کو یکجا کیا جانا ضروری ہے تبھی ہم مکمل مجتبیٰ حسین کو سمجھ سکتے ہیں۔ان کی غیر ظریفانہ تحریروں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے ان کے دیباچوں اور پیش لفظ کو بھی یکجا نہیں کیا جا سکا ہے۔ نہ معلوم مجتبیٰ صاحب کی توجہ اس جانب کیوں نہیں اور وہ موجودہ کتابوں پر ہی کیوں قانع ہو کر رہ گئے ہیں۔ان کے فکر وفن پر کافی اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ ان پر مختلف ریسرچ اسکالر نے تحقیقی وتنقیدی کام کیے ہیں لیکن میں بڑی ذمے داری سے کہتا ہوں کہ مجتبیٰ صاحب کی تحریروں کی سطور کو تو لوگوں نے بہت حد تک سمجھا لیکن ان کے بین السطور کو سمجھنا ابھی باقی ہے۔ان کی ظرافت میں دانشورانہ افکار کی تفہیم کا قرض بھی ابھی ادا نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارے ظرافت نگاروں کا یہ المیہ ہے کہ ان کے فکر وفن پر لکھنے والے عموماً ظرافت کی تلاش تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اگر اسلوب شگفتہ بیانیہ سے تعلق رکھتا ہو تو لوگ اس سے اور سرسری گزرتے ہیں۔اس سرسری گزرنے میں کیا کیا سر سے گزر جاتا ہے انھیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔مختلف کیفیات کی چند مختصر مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱) ''انفرادی سچ ایک منزل پر پہنچ کر، جب اجتماعی جھوٹ میں بدل جاتا ہے تو یہ وقت بہت برا ہوتا ہے''۔

۲) ''پاگل خانے کا صداقت نامہ کسی یونیورسٹی کی تعلیمی سند کے مقابلہ میں زیادہ معتبر اور مستند ہوتا ہے''۔

۳) ''امریکہ کے صدر کو زکام کا عارضہ بھی لاحق ہو جاتا ہے تو عالمی مارکٹ میں نزلے اور زکان کی دواؤں کے دام بڑھ جاتے ہیں اور امریکی صدر کا نزلہ کمزور ملکوں کی حیثیت پر گرنے لگتا ہے''۔

۴) ''بعض لوگ اس ملک میں سیکولرزم کو بھی اس طرح پھیلانا چاہتے ہیں جیسے گندگی پھیلانا چاہتے ہوں''۔

۵) انگریزی میں گالی دی جائے تو وہ گالی کم خیر سگالی زیادہ معلوم ہوتی ہے''۔

۶) ''کچھ لوگوں میں اپنے بل بوتے پر گمراہ ہونے کی بڑی زبردست صلاحیت ہوتی ہے''۔

۷) ''شہرت جب ایک خاص حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو وہ بدنامی کی حدوں سے داخل ہو جاتی ہے''۔

۸) ''ہمارے ادب میں بہت سے اہل قلم کو صرف اس لیے شہرت ملی کہ ان میں صلاحیت کم اور خوش فہمی زیادہ تھی''۔

۹) ''ہماری بعض شاعرات کی شاعری میں شاعری کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی ''ماورائے شاعری'' کی ہوتی ہے''۔

ایسے فقرے اور اقتباسات مجتبیٰ صاحب کے یہاں بہت ہیں۔ان پر ذرا ٹھہر کر غور کرنے سے فنی تفہیم کی نئی راہیں روشن ہوں گی۔

مجتبیٰ صاحب اس عمر میں بھی حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ملک میں بڑھتی ہوئی عدم رواداری، تعصب اور فرقہ واریت کے خطرناک زہر کی وجہ سے ان کا دلی اضطراب چھپائے نہیں چھپتا۔ایک دن دوران گفتگو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ کبھی جھانسی کی رانی کا زمانہ تھا آج جھانسے کے راجا کا دور ہے۔ یاسیت کے دراز ہوتے سایوں نے ان کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں کھینچ دی ہیں۔سیکولر قوتوں کی پسپائی انھیں بے حد بے چین رکھتی ہے۔انھوں نے راج بہادر گوڑ کے خاکے میں لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ایک سوال میں ڈاکٹر گوڑ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ آج کے حالات میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بننا پسند کریں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی انھیں پھر سے پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوشش کرے تو کہیں وہ پھر سے ہتھیار نہ اٹھالیں''۔

یہ خاکہ ۱۹۹۳ء میں لکھا گیا تھا آج ۲۰۱۷ء کے سیاسی تناظر میں ان کی ذہنی کیفیت کیا ہو سکتی ہے اس اقتباس کی روشنی میں اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کو اپنی بڑھتی عمر کا شدید احساس ہونے لگا ہے۔ ان کے سبھی قریبی دوست ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ان کی صحت بھی اب ان کا ساتھ نہیں دیتی ایسے میں حواس پر احساس محرومی کا چھا جانا تعجب خیز نہیں۔ یہی احساس ان سے ایسے جملے لکھواتا رہا کہ اب میں اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور تاریخ وفات سے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ اپنی ٹیلی فونی گفتگو میں جب وہ زندگی کے تعلق سے مایوسی بھری باتیں کرتے ہیں تو اسے سن کر دل بھر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جیسے جیسے عمر کا آفتاب ڈھلتا ہے ویسے ویسے صحت کی آنکھ مچولی کا کھیل گہرا ہوتا جاتا ہے۔ ایسے عالم میں قوت خود اعتمادی عصائے موسیٰ کا کام کرتی ہے۔ مجتبیٰ صاحب کا ہی قول ہے کہ ''انسان کی عمر کیلنڈروں سے نہیں بلکہ اس کے اپنے احساس اور رویے سے طے ہوتی ہے''۔ وہ اپنے احساس اور رویے کو مثبت رخ عطا کرتے ہوئے صرف اتنا یاد کرھیں کہ نہ صرف اردو ظرافت بلکہ پورے اردو ادب کے لیے ان کا وجود نہایت قیمتی ہے۔ ان کے ہونے سے ہم جیسے نہ جانے کتنوں کو اپنے ہونے کا یقین باقی ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ وہ تادیر اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہوئے ہم سب کی رہنمائی فرماتے رہیں۔

اے اہل مجلس! ہم بڑے شوق بخت ہیں کہ آج مجتبیٰ صاحب بزم صدف کی زینت ہیں۔ آپ جی بھر کر انھیں دیکھ لیں کہ ایسی صورتیں روز روز دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ایسی صورت کا دیدار ہماری زندگی کو زیادہ بامعنی اور پُر وقار بنا دیتا ہے اور ہم اپنے کو پہلے سے زیادہ توانا اور ثروت مند سمجھنے لگتے ہیں۔

(۲۹ر دسمبر ۲۰۱۷ء کو بہار اردو اکادمی پٹنہ کے ہال میں منعقدہ ''بزم صدف انٹرنیشنل'' کے سیمینار میں پڑھا گیا)

نذرِ مجتبیٰ حسین

(رباعیاں)

اک عمر پہ دُرّ بے بہ کو دیکھا
اعجاز ہنر رب کی عطا کو دیکھا
کس فخر سے کہہ رہی ہیں آنکھیں میری
ہاں دیکھا، ہم نے مجتبیٰ کو دیکھا

☆☆☆

ندرت کا، لطافت کا پیکر دیکھا؟
تقدیر ظرافت کا پیکر دیکھا؟
ہم نے تو مقدر سے اسے دیکھ لیا
کیا تم نے ذکاوت کا پیکر دیکھا؟

☆☆☆

لاریب یہ طرز گفتگو اس کا ہے
شہرہ ہے جو چہار سو اس کا ہے
یونہی تو ممانے میں نہ پھیلی یہ ضیا
دانش کے چراغوں میں لہو اس کا ہے

☆☆☆

دیکھو دیکھو یہ ارجمندی اس کی
ہے رشک فلک طفر بلندی اس کی
ہنستے ہنستے رُلا دے جو قاری کو
ایسی ہے لطیف درد مندی اس کی

☆☆☆

پھولوں کی طرح کانٹوں پہ چلنے والا
دکھ درد کی آنچ سے پگھلنے والا
آتا ہی نہیں کوئی نظر اس کے سوا
اشکوں کو تبسم میں بدلنے والا

☆☆☆

تحریر میں ندرت کے عناصر پنہاں
انوارِ بیصرت کے عناصر پنہاں
جس وقت وہ ہنستا ہے تو ہو جاتے ہیں
آواز میں رقت کے عناصر پنہاں

☆☆☆

الفاظ کی توقیر بڑھا دیتا ہے
جذبات کی تاثیر بڑھا دیتا ہے
آہوں کا دھواں اٹھتا ہے جب بھی دل سے
وہ شوخی تحریر بڑھا دیتا ہے

☆☆☆

ترکش میں ہزاروں ہیں بشاشت کے تیر
کیسے نہ چلائے وہ ظرافت کے تیر
اٹھتی ہیں عجب دل میں کسک کی لہریں
چھوڑے جو اچانک وہ شرارت کے تیر

☆☆☆

چوٹی تھی بہت اونچی مگر چھولی
اس کی محنت بھی غیر معمولی ہے
جب خون جگر سے اس نے سیراب کیا
تب فصل ظرافت کی پھلی پھولی ہے

☆☆☆

نشتر کی طرح تیز ہیں اس کی باتیں
اشکوں سے بھی لبریز ہیں اس کی باتیں
باتوں میں نئی باتیں کرے وہ پیدا
شاداب ہیں، زرخیز ہیں اس کی باتیں

☆☆☆

دنیا میں کہاں نہیں ہے شہرت اس کی
ہر دل میں سما گئی ہے چاہت اس کی
کھینچے نہ زمانے کیوں دامن دل
معمور بصیرت سے ظرافت اس کی

☆☆☆

گل ہائے مسرت کا گلشن ہے وہی
لوگوں کے دل و ذہن میں روشن ہے وہی
چشمے بھی ذہانت کے اسی سے ہیں رواں
تہہ دار طرافت کا مخزن ہے وہی

☆☆☆

افکار کی تازگی ہے ان میں موجود
اس عہد کی آگہی ہے ان میں موجود
تحریریں مجتبیٰ کی سبحان اللہ
تہذیب کی روشنی ہے ان میں موجود

☆☆☆

اڑتا ہی رہا اس کا رہوار قلم
تاباں نہ رہیں کیسے افکار قلم
کیا آنکھ ملائے گا زمانہ اس سے
سالارِ قلم ہے وہ سالارِقلم

☆☆☆

اخلاق و محبت کا اجالا اس سے
آباد شرافت کا شوالا اس سے
تہذیب و تمدن کے گہوارے میں
جو بھی ہے کمی ہوگا ازالا اس سے

☆☆☆

سعیدہ پٹیل

مضمون

پروفیسر عبدالستار دلوی ایک ادارہ ساز شخصیت

پروفیسر عبدالستار دلوی اُردو ادب کی ایک سربرآوردہ اور جلیل القدر شخصیت ہیں۔ ان کے علمی اکتسابات اور قلمی رشحات گزشتہ کئی دہوں سے اُردو زبان وادب کے تخلیقی اور تحقیقی سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کررہے ہیں۔ پروفیسر دلوی کا شمار ماہرِ لسانیات کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ وہ اُردو کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی اور مراٹھی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ علمی وادبی تحقیق کی دنیا میں ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ علمی وادبی دنیا میں جس طرح وہ اظہر من الشّمس ہیں اسی طرح ادارہ سازی میں بھی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ نئے اداروں کو قائم کرنا اور بہ حسن و خوبی انھیں چلانا صرف اسی شخص کا کام ہے جس میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں اور بادِ مخالف کو برداشت کرنے کی قوت ہو۔ پروفیسر دلوی نے اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی کی انتظامی صلاحیتیں اس وقت منظرِ عام پر آئیں جب انھوں نے ۱۹۶۷ء میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اینڈ لائبریری کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا۔ اس ریسرچ سینٹر کے قیام کا مقصد مہاتما گاندھی کے قومی نظریے کو فروغ دینا تھا۔ مہاتما گاندھی ہندوستان کی قومی زبان یعنی ہندوستانی یا وہ زبان جو غیر فارسی آمیز اُردو اور غیر سنسکرت آمیز ہندی کی آمیزش سے تشکیل پاتی ہو۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ عام بول چال کی زبان کو اہمیت دیتے تھے۔ گاندھی جی کی یہ بھی خواہش تھی کہ یہ ہندوستانی زبان دونوں لپیوں اُردو اور ہندی میں لکھی جائے۔ اس ریسرچ سینٹر کے بانی ڈائرکٹر کی حیثیت سے پروفیسر دلوی موزوں ترین شخص تھے۔ تقرر کے وقت جب ان سے ان کی تعلیمی صلاحیتوں کے ساتھ ہندی دانی کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے ہندوستانی پرچار سبھا کی 'قابل' (مساوی بارہویں درجہ) کی سند پیش کردی۔ پروفیسر دلوی اُردو، ہندی کے علاوہ کئی زبانوں اور بولیوں سے واقف تھے اور ان زبانوں کا لسانی درک رکھتے تھے۔ لسانیات سے ان کی دلچسپی اور مہارت کے ساتھ ساتھ قومی مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ پروفیسر دلوی کی دوررس نظروں، عملی افکار، محنت اور لگن سے اس ادارے کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ آج اس ادارے کا شمار اُردو ہندی کے ایک بے مثال ادارے کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ پروفیسر دلوی نے جب اس ریسرچ سینٹر کو جوائن کیا تو وہاں صرف دو چار نفوس کا اسٹاف تھا۔ انھوں نے اس سینٹر کی ضروریات اور افادیت کی خاطر اسٹاف ممبرز کا اضافہ شروع کردیا۔ کلرک آسامیوں کے علاوہ لائبریری کی دیکھ بھال کے لیے مخصوص اسٹاف کا تقرر ہوا۔ ریسرچ کے لیے ریسرچ آفیسرز کی بھی گنجائش نکالی گئی۔ ۱۹۸۲ء میں پروفیسر دلوی وہاں سے رخصت ہوئے تو ادارے کا کل اسٹاف سترہ افراد پر مشتمل تھا۔ انھوں نے اس ادارے کے لیے اُردو، ہندی، فارسی، سنسکرت، لسانیات، تاریخ اور دیگر موضوعات پر تیس ہزار سے زیادہ کتابیں مہیا کرلی تھیں۔ انھوں نے کئی تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے جو مختلف رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ 'امرت بانی' نامی مشہور کتاب انھوں نے اسی ادارے سے منسلک رہ کر لکھی۔ 'امرت بانی' میں اُردو اور ہندی کے مختلف شعرا کا منتخب کلام شامل ہے۔ یہ اُردو و ہندی کی آمیزش سے ترتیب دی گئی ہے اور ایک تفصیلی مقدمے کے ساتھ اسے شائع کیا گیا تھا۔ مشہور ماہرِ لسانیات اور عالم ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس کتاب

کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ:

''قومی زبان کے گاندھی جی والے نظریے کے تحت میں اس طرح کی کتاب دیکھنے کا گزشتہ چالیس سال سے خواہش مند تھا۔'امرت بانی' دیکھنے سے آج میری آرزو پوری ہوگئی۔''

(صفحہ نمبر۱۴)

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر میں رہ کر پروفیسر دلوی نے لسانی، ادبی اور ثقافتی موضوعات پر بے شمار مباحث، خطبات اور مذاکرات کا انعقاد کیا۔ ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے طلبہ کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔اس ریسرچ سینٹر سے ایک مجلّہ 'ہندوستانی زبان' بھی پروفیسر دلوی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ رسالہ اپنے اعلیٰ معیار کے لیے ہندوستان کے علاوہ انگلستان اور دوسرے مالک میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس رسالے کے دو خصوصی شمارے 'امیر خسرو نمبر' اور 'سورداس نمبر' علمی و ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئے اور ان رسالوں کی اہمیت حوالہ جاتی ہوگئی۔ اس مجلّے میں اُردو اور ہندی دو حصوں میں بہترین تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنے والے پروفیسر دلوی کو اس ریسرچ سینٹر کی اکیڈمک کمیٹی کے ممبران کا بھی بھرپور تعاون حاصل تھا۔ ان کے زمانے میں کئی انمول کتابیں، رسائل کے خصوصی نمبر، قلمی نسخے اور ڈکشنریاں اس لائبریری میں بطور بیش قیمت خزانہ جمع کی گئیں۔ اس خزانے نے ریسرچ سینٹر اور لائبریری کو نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کی بھی ایک بہترین لائبریری بنا دیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر دلوی نے برگزیدہ ادیبوں اور شاعروں کی تصویریں مختلف وسائل سے مہیا کر کے آویزاں کی تھیں۔ ساتھ ہی عمارت پر اور اندر ریسرچ سینٹر میں سارے نام دونوں لپیوں اُردو اور دیوناگری میں لکھے گئے تھے جو اَب نظر نہیں آتے۔ پروفیسر دلوی کی خدمات کے پیشِ نظر مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور لائبریری نے ان کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ 'مہاتما گاندھی، اقبال، اُردو اور دیگر مضامین' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مضامین گاندھی جی کے نظریات، ان کی اُردو سے محبت اور ڈاکٹر اقبال کے جذبۂ حب الوطنی کی قدر کا جہاں احاطہ کرتے ہیں وہیں اُردو زبان میں پوشیدہ اس خزانے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جس میں اُردو والوں کی تہذیب سے وابستگی اور دوسری زبانوں کا ادبی رجحان اور ان کی نثری و شعری تخلیقات کا تعارف اور بالخصوص مراٹھی و اُردو کے مضامین اور مہاراشٹر کی ممتاز شخصیتوں کے ذکر پر جامع مضامین ہیں۔

مہاراشٹر کے چیف منسٹر ایس۔بی۔ چوہان نے ۱۹۷۴ء میں اُردو اکیڈمی بنانے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا اس وقت ریونیو منسٹر تھے۔ وہ ایس۔بی۔ چوہان کے پاس اُردو اکیڈمی کے قیام کے اعلان پر شکریہ ادا کرنے گئے اور ساتھ میں پروفیسر دلوی کو بھی لے گئے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے چیف منسٹر سے پروفیسر دلوی کا تعارف کراتے ہوئے تعریفی کلمات کہے اور کہا کہ پروفیسر دلوی نے 'من سمجھاون' نامی کتاب ایڈٹ کی ہے جو مراٹھی کی مشہور کتاب 'منا چے شلوک' کا اُردو ترجمہ ہے۔ ایس۔بی۔ چوہان بہت متاثر ہوئے۔ اُردو اکیڈمی کے عہدیداران کی فہرست میں خواجہ عبد الغفور، کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی وغیرہ تھے۔ جب گورنمنٹ کی فہرست آئی تو اس میں خواجہ عبدالغفور کو جنرل سکریٹری اور پروفیسر عبدالستار دلوی کو اُردو اکیڈمی کا جوائنٹ سکریٹری نامزد کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر کی طرح اُردو اکیڈمی کی بنیاد میں بھی پروفیسر دلوی کا خون پسینہ شامل ہے۔ مہاراشٹر حکومت نے ان کی خدمات اس غرض سے حاصل کی تھیں کہ وہ مراٹھی اور اُردو

ونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کے مالک تھے۔ اُردو اکیڈمی سے ایک رسالہ 'امکان' نامی شائع ہوا کرتا تھا جس کی ایڈیٹر سلمیٰ صدیقی تھیں اور پروفیسر دلوی ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھے۔ خواجہ عبد الغفور کے بعد وہ اکیڈمی کے کارگزار سکریٹری بنائے گئے۔ بعد ازاں اس اُردو اکیڈمی کے دو مرتبہ ایگزیکیوٹیو چیئرمین منتخب کیے گئے۔ پروفیسر دلوی نے اپنی کارگزاری کے زمانے میں اس ادارے کی بہترین کارکردگی کے لیے چند اُصول بھی مقرر کیے تھے۔ اُردو ادب کی مختلف اصناف میں ادیبوں اور شاعروں کو انعامات سے نوازا گیا۔ مراٹھی کی قابل تخلیقات کا اُردو میں اُردو کی گرانقدر تخلیقات کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کیا گیا اور بہترین تراجم انعامات کے حقدار ہوتے تھے۔ اُردو اکیڈمی کی ترقی پروفیسر دلوی کی دوررس نگاہ اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اُردو اکیڈمی سے پروفیسر دلوی تقریباً بارہ سال تک وابستہ رہے۔ انھوں نے مراٹھی کے معروف ادیب سانے گروجی کے ناول کا ترجمہ 'شام کی ماں' اور گڈکری کے مشہور ڈراما 'ایک ہی پیالہ' کا ترجمہ بھی کیا۔ ان بارہ سالوں میں وہ اُردو زبان و ادب کے فروغ اور ارتقا و بقا کے لیے مسلسل کوششیں کرتے رہے۔

نقشِ کوکن ٹرسٹ سے ایک ماہنامہ 'نقشِ کوکن' شائع ہوتا ہے۔ یہ ماہنامہ اُردو زبان و ادب اور مختلف فنی خوبیوں کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے اور نئے قلم کاروں کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے۔ پروفیسر دلوی تقریباً چار سال اس ماہنامے کے مدیر رہے ہیں۔ پروفیسر یونس اگاسکر نقشِ کوکن ٹرسٹ کے ریسرچ فیلو اور ماہنامہ کے اسسٹنٹ مدیر رہ چکے ہیں۔

۱۹۸۲ء سے قبل ممبئی یونیورسٹی سے الحاق رکھنے والے کالجوں میں اُردو کے شعبے ہوا کرتے تھے جہاں طلبہ ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی تعلیم، تربیت اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ سو سال سے زیادہ پرانی ممبئی یونیورسٹی کے مرکز میں شعبۂ اُردو نہیں تھا۔ ۱۹۸۲ء میں یونیورسٹی نے شعبۂ اُردو قائم کیا۔ کرشن چندر پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو کے عہدے کے لیے پروفیسر عبدالستار دلوی کو منتخب کیا گیا۔ پروفیسر دلوی نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۷ء تک نہایت اعلیٰ انتظامی لیاقت اور علمی قابلیت سے اس شعبے کو سنوارا۔ انھوں نے مذکورہ دو بڑے اداروں سے جو انتظامی تجربہ حاصل کیا تھا اس سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے شعبۂ اُردو کو ایک فعال شعبے کی حیثیت عطا کی۔ تعلیم و تدریس، علمی و ادبی مذاکرات کا مرکز پروفیسر دلوی کی بدولت مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر سے شعبۂ اُردو ممبئی یونیورسٹی، کالینا منتقل ہوگیا۔ یہاں بھی انھوں نے بے شمار خطبات، سیمینار اور سمپوزیم منعقد کیے۔ اس کے علاوہ لسانی، ادبی اور ثقافتی موضوعات پر مباحث اور سیمینار کا انعقاد کیا جس میں ملکی اور بین الاقوامی شہرت کے حامل حضرات نے نہایت دقیق ادبی اور لسانی مسائل پر اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کیا ہے۔ شعبہ صدر کی اہم ذمہ داریاں سنبھالنے کے باوجود وہ تحقیقی اور تخلیقی کاموں سے غافل نہیں رہے۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے پندرہ سالہ دور میں ان کی کئی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔ صدر شعبہ کی حیثیت سے پروفیسر دلوی نے مراٹھی اور اُردو کو قریب لانے کے لیے مراٹھی کے کلاسیکی ادب کے سرمایے کو ترجمے کے ذریعے اُردو قارئین تک پہنچایا ہے۔ انھوں نے جدید مراٹھی ادب کے تین شاہکار ناولوں کا ترجمہ کر کے اُردو کو مراٹھی کے جدید اسلوب سے آشنا کیا ہے۔ پہلا ناول پرشوتم رام دیگے کا ناول 'ساوتری' ہے جس کا ترجمہ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں کیا۔ دوسرا ناول وشرام بیڈیکر کا 'رن آنگن' ہے۔ اس کا ترجمہ ۱۹۸۷ء میں کیا۔ اس کتاب پر ساہتیہ اکیڈمی، دہلی نے انھیں ۱۹۹۰ء میں ترجمہ ایوارڈ سے نوازا تھا۔ تیسرا ناول پرشوتم شیو رام دیگے کا 'اولوکتا' ہے جس کا ترجمہ ۱۹۸۸ء میں کیا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی کو نثری تراجم کے علاوہ منظوم تراجم کا بھی شوق رہا ہے۔ انھیں ترجمہ نگاری کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ انھوں نے سنسکرت کے مشہور شاعر بھرتری ہری کی تقریباً پچپن نظموں کا ترجمہ 'جمالیاتِ بھرتری ہری' کے عنوان سے کیا ہے۔ مراٹھی صوفی شاعر سنت گیانیشور کی شہرہ آفاق نظم 'گیانیشوری' کے آخری دعائیہ حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ اسے 'پسائیدان' کہتے ہیں۔ یہ مراٹھی ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتا ہے۔ انگریزی زبان کے مشہور ہندوستانی شاعر پروفیسر نسیم ایزیکل عرصے تک ممبئی یونیورسٹی میں پروفیسر دلوی کے رفیق کار رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ۲۰/اگست سے ۱۲/ستمبر ۱۹۸۳ء کے دوران (جب وہ ایڈنبرا اور لندن کے دورے پر تھے) تیس مختصر وطویل نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں کا آزاد ترجمہ پروفیسر دلوی نے 'ذکرِ ایڈنبرا' کے نام سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری تخلیقات '(۱) اُردو زبان اور سماجی سیاق (۲) دکنی اُردو (۳) ادبی اور لسانی تحقیق - اُصول اور طریق کار' طلبہ میں مقبول ومحبوب ترین کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ممبئی یونیورسٹی میں رہ کر انھوں نے جتنا ادب تخلیق کیا اس سے زیادہ ادبی تخلیق کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔

شعبۂ اُردو ممبئی یونیورسٹی سے انسلاک کے زمانے میں مصر میں 'عین شمس یونیورسٹی' (قاہرہ) میں شعبۂ اُردو کی تاسیس کے لیے حکومت مصر کی دعوت پر اور حکومت ہند کی ایما (deputation) پر قاہرہ گئے تھے اور وہاں شعبۂ اُردو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پروفیسر دلوی نے وہاں جا کر اس ادارے سے وابستہ لوگوں کی معاونت اور رہنمائی کی۔ اپنی ذاتی نگرانی میں اُردو کی لائبریری کے لیے تقریباً پندرہ سو کتابیں بھی منگوائیں اور کئی رسائل بھی جاری کروائے۔ اس سے قبل وہ دو مرتبہ قاہرہ گئے تھے۔ پہلی مرتبہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (حکومت ہند) نے ثقافتی تبادلے میں انھیں قاہرہ روانہ کیا تھا جہاں اُنھوں نے جامعہ ازہر اور دوسری درس گاہوں میں 'اُردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں پر عربی کے اثرات' پر تقاریر کیں۔ اس سلسلے میں دوسری مرتبہ ۱۹۹۰ء میں قاہرہ میں ہند-مصر سیمینار بھی تھا جس میں دونوں ملکوں کے اسکالرز شریک تھے۔ پروفیسر دلوی کے خطبے کا موضوع تھا 'بیسویں صدی عیسوی میں ہندو مصر کے علمی ولسانی رشتے'۔ عین شمس یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے قیام کے بعد تقریباً باون طلبہ نے اُردو میں بی۔اے کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بعد ازاں وہاں ایم۔اے کی تمہیدی کلاسیس بھی شروع کی گئیں۔ تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں گزارا۔ ثقافتی تبادلے ہی کے سلسلے میں پروفیسر دلوی ۱۹۹۶ء میں ترکی گئے اور استنبول، انقرہ اور قونیہ یونیورسٹیوں میں مختلف مباحث اور مذاکرات میں شریک ہوئے۔ تقریباً ایک ہفتہ انھوں نے وہاں گزارا۔ انھوں نے تبادلہ خیالات کے دوران طلبہ کو بتایا کہ ہندوستان اور ترکی کے تعلقات کافی پرانے ہیں۔ مرزا غالبؔ اور امیر خسروؔ کا تعلق ترکی سے ہی تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کی مشہور ادیبہ خالدہ ادیب خانم ہندوستان آ کر مہاتما گاندھی سے ملی تھیں، وہ ان کی مداح تھیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں ایک لیکچر بھی دیا۔ اس کے بعد وہ ممبئی آئیں اور جسٹس طیب جی کے خاندان کی خواتین سے تعلیم نسواں پر اظہارِ خیال کیا۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ یونیورسٹی گئیں جہاں انھوں نے ایک نظم بھی پڑھی تھی اور وہاں کے طلبہ نے ان کے استقبال میں پھول بھی برسائے تھے۔

پروفیسر دلوی نے استنبول یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملاقات کی۔ قونیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو بھی ہے۔ جب پروفیسر دلوی وہاں پہنچے طلبہ نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔

۱۹۹۵ء میں قطر (سعودی عربیہ) میں پروفیسر دلوی نے انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کی۔ ہندوستان سے گوپی چند نارنگ

اور پاکستان سے محمد علی صدیقی اور جیلانی کامران ان کے ہمراہ تھے۔ یہ سیمینار حضرت امیر خسرو پر تھا۔

پروفیسر عبدالستار دلوی ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۵ء شہر پونہ کے تحقیقی ادارے دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر رہے ہیں۔ وہاں رہ کر انھوں نے ادارے کے کاموں کو بڑی وسعت دی اور اُردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو جمع کیا اور کام کی تقسیم کی۔ ہندوستانی زبانوں اور فارسی زبان کے لسانیاتی رشتے پر ایک تین روزہ سیمینار منعقد کروایا جسے عوام الناس نے بے حد پسند کیا۔ اس کے علاوہ کئی سیمینار اور لیکچرز کا انعقاد کیا۔ آل انڈیا پرشین ٹیچرز کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔ علاوہ ازیں وہاں رہ کر بھی تصنیف وتالیف کے کاموں سے غافل نہیں رہے اور ان کی کتابیں (۱) دو زبانیں دو ادب (جو اُردو اور ہندی کے تناظر میں لکھی گئی ہے اور گیان چند جین کی کتاب دو بھاشا اور دو لکھاوٹ کے جواب میں تحریر کی گئی ہے) (۲) علی سردار جعفری - شخصیت، شاعر اور ادیب (۳) پروفیسر عبدالقادر سرفراز - احوال و آثار (۴) پونے کے مسلمان شائع ہوکر منظر عام پر آئیں۔

پروفیسر دلوی کی وسیع علمی اور انتظامی صلاحیت اور تجربے کو دیکھتے ہوئے ادارہ انجمن اسلام کے عہدیداران نے انھیں ۲۰۰۷ء میں اُردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر اور مجلّہ نوائے ادب کا مدیر منتخب کیا۔ انھوں نے یہ دونوں ذمہ داریاں بخوبی سنبھال لیں۔ تا حال وہ اسی عہدے پر قائم ہیں اور بڑی محنت سے اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ پروفیسر دلوی نے جب اس ادارے کا کام سنبھالا یہاں دو افراد پر مشتمل اسٹاف تھا اور کل کتابیں تئیس ہزار کے لگ بھگ تھیں۔ پروفیسر دلوی کا ذوقِ ادب اور دور رس نگاہیں اُردو ادب کے ذخائر پر ہمیشہ مسلط رہتی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اس ادارے کے اسٹاف میں ایک کوالیفائیڈ لائبریرین، ایک ریسرچ آفیسر اور ایک کمپیوٹر ٹائپسٹ کا اضافہ کیا۔ اور ہر سال سارے ہندوستان سے نایاب ترین اور بیش قیمت کتابیں جمع کرنا شروع کیں۔ آج اس ادارے میں تقریباً تیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ تقریباً اٹھارہ ماہنامے اور سہ ماہی مجلّے باقاعدگی سے منگوائے جاتے ہیں۔ اس ادارے کا رسالہ 'نوائے ادب' کے معیار میں بھی فرق آیا ہے۔ مضامین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ رسالہ ششماہی سے پھر سہ ماہی ہوگیا ہے۔ کوئی بھی معیاری رسالہ نکالنا بڑا مشکل کام ہے۔ مضامین کا فراہم کرنا، ان کی زبان اور طرزِ ادا کو درست کرکے رسالے کے مزاج اور معیار کے مطابق شائع کرنا تصنیف وتالیف سے کم اہم نہیں ہوتا۔ پھر ان کی کتابت وطباعت میں بھی محنت درکار ہوتی ہے۔ پروفیسر دلوی کا سابق مجلّاتی صحافت کا تجربہ اس میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کے شذرات میں اُردو کے حامیوں اور خدمت گزاروں کے لیے کوئی نہ کوئی پیام موجود ہوتا ہے۔ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۷ء تک رسالہ 'نوائے ادب' کے مندرجہ ذیل خصوصی شمارے پروفیسر دلوی کی ادارت میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) گوشۂ رالف رسل (۲۰۱۰ء)، (۲) اقبال نمبر (۲۰۱۲ء)، (۳) علی سردار جعفری نمبر (۲۰۱۴ء)، (۴) علامہ شبلی پر خصوصی شمارہ (۲۰۱۵ء)، (۵) اُردو ذریعہ تعلیم کی عصری معنویت اور یادِ اساتذہ نمبر (۲۰۱۵ء)۔

اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اپنی ابتدا سے ہی تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی مدد کرتا ہے۔ ان طلبہ کی رہنمائی اور اُردو کے فروغ کے سلسلے میں یہاں توسیعی خطبات، یادگاری خطبات اور مذاکروں کا بھی اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر دلوی کے دورِ صدارت میں مندرجہ ذیل اہم سیمینار اور خطبات کا انعقاد کیا گیا ہے۔

(۱) ممبئی میں اُردو کی موجودہ صورت حال

(۲) تعلیم اور تحقیق میں کتب خانوں کی افادیت اور اہمیت

(۳) پریم چند کی ادبی خدمات

(۴) فارسی و اُردو کے لسانی و ادبی رشتے

(۵) مولانا جلال الدین رومی

(۶) اُردو میں تاریخ نویسی

(۷) عبدالقادر بیدلؔ اور اقبالؔ

یادگاری خطبات میں سیرتِ نبویؐ پر یادگاری خطبات کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں قدیم ادب کا ایسا ذخیرہ بھی ہے جسے منظرِ عام پر لانا ضروری ہے۔ صوفیائے کرام کے اصل کارناموں کو بھی شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ انجمن اسلام نے ابتدا سے ہی اس ادارے کے تحت اہم کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا مگر مالی مشکلات اس کی راہ کی رکاوٹ ہیں۔ پروفیسر دلوی نے ۲۰۰۸ء میں تقریباً چار لاکھ روپیوں کا عطیہ اکٹھا کیا تاکہ ریسرچ اسکالرز کے وظیفے اور دوسری ضروریات میں کام آسکے۔ نایاب مگر اہم کتابوں کے لیے انھوں نے تقریباً ڈھائی لاکھ روپے جمع کیے ہیں۔ رسالہ 'نوائے ادب' کے خصوصی شماروں کے لیے تقریباً پندرہ ہزار روپے اور چند سرپرستوں اور اُردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والوں سے مالی امداد بھی حاصل کی ہے اور اُردو ادب کے بے لوث خدمت گاروں میں اپنا نام شامل کرلیا ہے۔ اُردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ذریعے انجمن اسلام نے تقریباً بتیس (۳۲) کتابیں شائع کی ہیں۔ پروفیسر دلوی نے کئی اہم کتابیں مرتب کی ہیں اور اپنی زیرِ نگرانی شائع کروائی ہیں۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) اقبالؔ اور ممبئی

(۲) مقالاتِ پروفیسر نجیب اشرف ندوی

(۳) مقالاتِ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار

(۴) مبادیاتِ تحقیق (دوسرا ایڈیشن مع اضافہ)

(۵) شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی (دوسرا ایڈیشن)

(۶) ادبی اور لسانی تحقیق اور تقابلی ادب

(۷) سیّد عبدالفتاح گلشن آبادی اور قصیدہ بردہ

احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اُردو ادب اور ادارہ انجمن اسلام کی خدمت کا جذبہ پروفیسر دلوی کو ہمیشہ محرک اور فعال رکھتا ہے۔ ادارہ انجمن اسلام کے عہدیداروں کو یقین ہے کہ پروفیسر دلوی کی مدبرانہ اور ماہرانہ قیادت میں اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ترقی کرتا رہے گا۔ وہ اپنے انسٹیٹیوٹ کے اسٹاف اور عہدیداران میں یکساں طور پر مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ پروفیسر دلوی کے آئندہ منصوبوں میں اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ڈیجیٹلائزیشن کرنا اور اشاعتی پروگرام کو مزید آگے بڑھانا شامل ہے۔ اس سمت میں ابتدا ہوچکی ہے۔ اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اپنی ایک شاندار علمی تاریخ ہے اور پروفیسر دلوی کی کوشش ہے کہ اس روایت کو مستحکم بنیادوں پر جاری رکھا جائے۔ ان کی علمی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ترقی کی راہ پر ہمیشہ گامزن رہے گا۔

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس'' کے شمارے پڑھے جاسکتے ہیں۔ صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جاسکتا ہے۔

یٰسین احمد

مضمون

جتیندر بلو کا آخری پڑاؤ

جتیندر بلو نے اپنی کتاب آخری پڑاؤ کے ابتدائی صفحات پر لکھا ہے۔ ''آخری پڑاؤ میرا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے اور شاید آخری بھی۔ چونکہ میری زندگی کا نومبر ڈسمبر شروع ہو چکا ہے۔ جانے کب اپنا وقت پورا کر کے چلا جاؤں۔ میں خضر تو ہوں نہیں جو صدیوں حیات رہے گا اور کائنات کو اپنی مرضی سے چھوڑے گا۔''

موت یقینی ہے مگر کوئی بشر نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی زندگی کا نومبر ڈسمبر آ چکا ہے۔ جتیندر بلو سلجھے ہوئے دماغ کے تخلیق کار ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں اُمیدوں کے روپہلی اُجالے ہیں۔ آرزوؤں اور ارمانوں کے متبسم کلیوں کی شگفتگی ہے ۔جام ہے۔ مینا ہے۔ لب ورخسار کی باتیں ہیں۔ گیسوں کی ٹھنڈک ہے اور سلگتے ہوئے جسموں کی گرماہٹ بھی۔ ایسے کردار بھی ہیں جو دُکھ بیماریوں سے جھوجھ رہے ہیں اور موت کی تمنا کر رہے ہیں۔ کتاب کی پہلی کہانی آخری پڑاؤ کا کردار رام مورتی مختلف بیماریوں کا شکار ہے۔ ان امراض نے اُس کے توانا اور وجیہہ جسم کو دیمک کی طرح چاٹ چکے ہیں۔ اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہے۔ چلنا پھرنا دشوار ہے۔ رام مورتی کی اس حالت کو دیکھ کر اُس کی پوتی اپنے باپ سے ایک دفعہ کہتی ہے۔

''ڈیڈ! میں چھوٹی تھی تو گرینڈ پا کتنے ہینڈسم تھے ۔کتنے اسمارٹ تھے۔ میں کبھی نہیں بھولتی۔ مگر اب ان کو دیکھ کر ڈر جاتی ہوں۔ یہ بلو تو ان کو فرینکن اسٹائن بھی کہتا ہے۔''

پوتا اور پوتی کے ان تبصروں نے رام مورتی کو اور دلگرفتہ کر دیا ہے۔ زندگی چھوڑ دے پیچھا میرا میں باز آیا کی تصویر بن چکا ہے۔ وہ ایڑیاں رگڑ کر مرنا نہیں چاہتا۔ وہ زیورک (سوئیزلینڈ) جا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ جہاں زندگی سے عاجز آئے ہوئے مریضوں کو موت کی نیند سو جانے کی قانونی طور پر اجازت ہے۔ رام مورتی زیورک جانے کی خواہش کا اظہار اپنے بیٹے سریش سے کرتا ہے۔ بیٹا ہر وقت خاموش رہتا ہے۔ مگر بلا آخر بیٹا رام مورتی کو لے کر ائیر پورٹ چلا جاتا ہے جہاں زیورک جانے والا ہوائی جہاز تیار کھڑا ہے۔ کہانی کی آخری منظر کشی جتیندر بلو نے کتنے متاثر انداز میں کی ہے ملاحظہ کیجئے۔

''وہیل چیر پر بیٹھا ہی تھا کہ اس میں فوراً حرکت پیدا ہوئی کرسی لحہ بہ لحہ آگے بڑھتی رہی۔ لیکن رام مورتی پلٹ پلٹ کر فضا میں دایاں ہاتھ لہراتا' مسکرا کر سریش کو دیکھتا رہا۔ اس کا عمل تب تک جاری رہا جب تک وہ مسافروں کی بھیڑ میں کھو نہیں گیا۔ سریش دیر تک بت بنا رہا۔ اُس کی دُنیا زیروزبر ہو گئی تھی۔''

زندگی وردان ہے۔ قدرت کا گراں قدر عطیہ ہے۔ بیماریاں انسان کا امتحان لیتی ہیں۔ اس امتحان میں انسان کے گناہ یوں دھل جاتے ہیں جیسے طوفانی بارش میں درختوں کے پتے.....لیکن اس کا کیا کیجئے کہ رام مورتی جیسے افراد ہمارے اطراف موجود ہیں۔ جن کے مزاج میں قنوطیت ہے۔ یاسیت ہے ۔اور ایسے حالات سے لڑنے کی طاقت نہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب کا اگلا افسانہ 'فرار' ہے۔جس میں مشرق ومغرب کا تصادم ہے۔رنگ ونسل کا ٹکراؤ ہے۔سفید فام قوم آج بھی اپنے آپ کو اعلیٰ وبرتر قوم تصور کرتی ہے۔اس افسانہ سے ماخوذ اس فقرہ کو سنیئے۔''لیکن میں جب رنگدار بچوں کو انگریز بچوں کے ساتھ دیکھتا ہوں تو یہ سوال مجھے پریشان کرتا ہے کہ میری قوم کا کیا بنے گا۔اس کی پاکیزگی اور عظمت برقرار رہے گی یا نہیں؟''

افسانہ کا راوی کمار ہے تو جو اسٹیلا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔اسٹیلا ایک مشہور ماڈل گرل ہے۔اپنے وقت کی بیوٹی ہے۔کریز ہے۔زبردست فگر Figure رکھتی ہے۔ایک عرصہ تک دونوں ازدواجی زندگی گزارتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اُن کے درمیان دوری آجاتی ہے۔قریب رہ کر بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔اس کی وجہ اولاد سے محرومی ہے۔فطری اور غیر فطری سارے حربے آزمانے کے باوجود بھی ان کو اولاد نہیں ہوتی۔محرومی کا یہ احساس اسٹیلا کی جسمانی خوبصورتی کو راکھ بنادیتا ہے۔وہ موٹی اور بھدی ہوجاتی ہے۔ہمستری کی لذتوں میں انحطاط آجاتا ہے۔ایک دفعہ اسٹیلا ایک پارٹی میں ایسی فضا ہموار کرتی ہے کہ کمار ایک دوسری عورت کے ساتھ رات گزارتا ہے۔وہ عورت میزبان بھی ہے۔صبح واپسی میں کمار اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔وہ اسٹیلا سے آنکھیں نہیں ملا پاتا۔اسٹیلا اُس کی شرمندگی کو اپنے سر اُٹھالیتی ہے اور کہتی ہے۔

''میں خوش ہوں تمہارے فیصلے سے! کل رات جو تجربہ میں نے کیا اچھا نہیں تھا۔لگا کہ میں اپنی انفرادیت' پاکیزگی اور عزتِ نفس کھو بیٹھی ہوں۔میں نے اپنے ساتھ تم کو بھی گمراہ کیا۔یہ میری بھول تھی۔''دل چسپ اندازِ بیان۔رواں دواں اسلوب اور بے پناہ مطالعاتی کشش سے بھرپور۔

جتیندر بلو کا خاندانی نام تو جتیندر دیولانیہ ہے۔۱۸/ نومبر ۱۹۳۷ء کو پیشاور میں پیدا ہوئے۔بٹوارے کے وقت ہندوستان آگئے۔یہاں بی اے کیا۔۱۹۷۵ء تک ممبئی میں رہے۔۱۹۷۶ء میں لندن چلے گئے اور تاحال وہیں مقیم ہے۔اُن کی کہانیوں میں لندن کا ماحول وہاں کی فضا' وہاں کے لوگ 'وہاں کی تہذیب جابجا ملتی ہے۔کتاب کا تیسرا افسانہ 'پورٹریٹ' ہے۔پورٹریٹ کے رنگوں میں سادگی ہے ایسی دلکشی نہیں کہ جی خوش ہوجائے۔کشن ایک آرٹسٹ ہے۔ایک دفعہ برطانوی سفارت خانہ میں کام کرنے والی لڑکی۔جیکی واکر کو دیکھتا ہے اور اُس پر فدا ہوجاتا ہے۔جیکی کو کچھ دنوں کے لئے لندن بلالیا جاتا ہے پھر وہاں سے اُس کو عراق بھیج دیا جاتا ہے۔جہاں ایک بم پلاسٹ میں اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔یہ سانحہ کشن کو نیم پاگل کردیتا ہے۔وہ کشن سے جیکشن ہوجاتا ہے اور اپنے آپ کو دُنیا کا بہت بڑا آرٹسٹ سمجھ لیتا ہے۔اسی زعم میں وہ ایک دفعہ ایک اجنبی کی بے تکی تصویر زبردستی بناتا ہے جس پر اجنبی مار مار کر اُس کی جان لے لیتا ہے۔جس طرح کسی شاعر کی ایک اچھی غزل میں دو ایک شعر بھرتی کے مل جاتے ہیں یہی سمجھ کر اس افسانہ کو پڑھ لیں۔

ڈالر' پونڈس اور ریال کی دُنیا بڑی حسین ہے۔اس حسین دُنیا کی چکر میں لوگ ہجرت کا کرب جھیلتے ہیں۔جتیندر بلو کی اگلی کہانی میں اس کرب کی کچھ جھلیاں ملتی ہے۔' سراب' کی کہانی تین افراد کے گرد گھومتی ہے۔کیلاش،ساوتری اور شنکر دت۔جتیندر بلو نے ان تین کردار کے حوالوں سے لندن اور ہندوستان کی سیاسی،سماجی اور معاشی تہذیب کا موازنہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔شنکر دت ایک عرصہ سے لندن میں مقیم

ہے۔اس کو سب کچھ مل گیا ہے جو اس کے سماجی رتبے کو بلندی اور وقار عطا کرتا ہے اس کے باوجود شنکر دت لندن میں تیسرے درجہ کا شہری بن کر زندہ ہے۔شنکر دت صرف جسمانی طور پر لندن میں ہے دل و دماغ تو ہندوستان کی سرزمین پر ٹکا ہوا ہے۔ایک اچھا افسانہ.....اور متاثر کن لب ولہجہ۔اُن آنکھوں کو وا کرنے کے لئے کافی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے باہر مال وزر کے دفینے سڑکوں پر بکھرے پڑے ہیں جو غیر قانونی طور پر باہر کے ملکوں میں مقیم ہیں اُن کو اپنے سائے سے بھی ڈرنا پڑتا ہے۔جینی پولینڈ سے آئی ہے۔ایک ہوٹل میں کام کرتی ہے جینی ایک انگریز طالب علم مارک کی محبت کے دام میں پھنس جاتی ہے۔لیکن جینی کو جب مارک کی بے وفائی کا پتہ چلتا ہے تو مارک کے چہرے پر ایک زوردار چانٹا جڑ دیتی ہے جو اُسے مہنگا پڑتا ہے۔مارک انتقامی کارروائی کرتا ہے اور جینی کو ڈی پورٹ Deport کر دیتا ہے۔

آخری پڑاؤ جتیندر بلو کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے اس سے پہلے جو افسانوی مجموعے آئے تھے اُن کے نام ہیں۔پہچان کی نوک پر(۱۹۸۶ء)'جزیرہ(۱۹۹۴ء)'نئے دیس میں (۱۹۹۸ء)'انجانا کھیل(۲۰۰۱ء) چکر(۲۰۰۷ء) درد کی حد سے پرے(۲۰۱۰ء)۔اس کے علاوہ جتیندر بلو نے دو ناول بھی لکھے ہیں۔اپنے لوگ اور وشواش گھاٹ۔جتیندر بلو کی سوانح حیات 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی ہے' بھی شائع ہو چکی ہے۔جس کی ادبی دُنیا میں کافی پذیرائی ہو رہی ہے۔برطانیہ کوئی مثالی معاشرہ نہیں رکھتا۔وہاں بھی تہذیبی گندگی ہے۔غلاظت ہر سطح پر ملتی ہے۔اس کا اندازہ جتیندر بلو کے اگلے افسانے 'چلڈرن ہوم کے بچے' کے مطالعہ سے ہوگا۔اس چلڈرن ہوم کا انچارج 'ڈیوڈ میکڈالنڈ لوطیت کا شکار ہے۔خوبصورت لڑکے اس کی کمزوری ہے۔اس افسانے کی بُنّت میں جتیندر بلو نے ماہرانہ انداز سے کام لیا ہے۔مذکرہ بالا افسانوں کے علاہ دو اور افسانے ایسے بھی ہے جس پر گفتگو کی جا سکتا ہے۔زیر مطالعہ کتاب کے اگلے افسانے کا نام ہے ٹوٹی ہوئی کڑیاں۔اس افسانہ پر میں اپنی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔مگر پاکستان کے مقبول افسانہ نگار ومبصر محمد امین الدین کی رائے کو دہراونگا جو انہوں نے سہ ماہی رسالہ ''اجراء'' کے شمارہ نمبر ۱۸ میں لکھا تھا۔

''جتیندر بلو کے وجود میں ممبئی کا چوپاٹی دریائے ٹیمز یکساں ہلکورے لیتا ہے۔ان کے اکثر افسانوں میں دو مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ سے کہانی جنم لیتی ہے۔مگر ٹوٹی کڑیوں میں اپنے زندگی کے اول نصف کی یادداشتوں سے اپنے افسانہ کے پلاٹ کو استوار کر رہے ہیں۔کبھی کبھی اپنی اَنا کو زیر کرنا ہو، ہَوا سے بھرے غبارے کو قابو میں کرنے جیسا ہوتا ہے۔ایک طرف سے سنبھالو تو دوسری سمت چلی جاتی ہے۔''

اس کتاب کی آخری کہانی ہم قدم ہے۔جس کا پس منظر مشرق کا وہ معاشرتی نظام ہے جہاں اخلاقی قدروں اور مذہبی روایت کی دھجیاں اُڑائی جارہی ہیں۔گریس میرتیج سرٹیفکٹ کو کاغذ کا بیکار ٹکڑا سمجھتا ہے اور رچرڈ کے ہمراہ ایک ہی چھت تلے طویل مدت تک زندگی گزارتا ہے۔جسمانی تعلقات بھی استوار کر رکھا ہے۔رچرڈ کے بار بار اسرار کرنے کے باوجود گریس شادی سے انکار کر دیتا ہے۔حتی ایں کہ ایک بچی کرولائن کی ماں بن جاتی ہے۔رچرڈ نہیں چاہتی کہ بچی کی پیدائش کے بعد بھی غیر شادی شدہ رہے۔اس کی وجہ کرولائن ہے۔وہ کہتی ہے۔''میں نہیں چاہوں گی کہ میری اولاد کو کوئی ناجائز بچہ یا باسٹرڈ یا Love Child کہے۔میں چاہوں گی کہ وہ سر اُٹھا کر سوسائٹی میں گھومے پھیرے کوئی اُس سے الٹا سوال نہ کرے۔''

گریس اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے۔دونوں کے درمیان اختلافات بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ گریس اور رچرڈ عارضی طور پر الگ ہوجاتے ہیں۔لیکن جب کرولائن بڑی ہوتی ہے تو گریس کو احساس ہوتا ہے کہ رچرڈ اور کرولائن اس کی زندگی کے دو پہیے ہیں اور اُن کے بغیر اس کی زندگی کی گاڑی کا چلنا مشکل ہے۔بلا آخر گریس شادی کے لئے راضی ہوجاتا ہے۔چلیئے کہانی ختم۔سیدھا سادہ پلاٹ لیکن جزیات سے بھرپور جتیندر بلو کا انفرادی انداز بیان قاری کو آخری لمحہ تک اپنے گرفت میں رکھتا ہے۔وہ زبان و بیان کو بے قابو ہونے نہیں دیتے۔ان کے افسانوں میں بے پناہ وسعت اور پھیلاؤ ہوتا ہے۔جہاں بھی موقع ملتا ہے' گنجائش ہوتی ہے سماجی سیاسی تاریخی اور مذہبی دیومالاؤں کے واقعات اور کرداروں کو دہرانا نہیں بھولتے۔انگریزی ، ہندی کے الفاظ کے استعمال میں بڑی برجستگی ہوتی ہے۔

ڈرنمارک کے نصیر ملک نے جتیندر بلو کی سوانح کو لاژ 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی' پر بتصرہ کرتے ہوئے کہا ہے۔''وہ آج بھی اپنی کہانیوں اور ناولوں کے لئے' خام مال اپنی قدیم و جدید معاشری منڈیوں سے تلاش کرتا ہے اور پھر اُسے اپنی سونچ وفکر کا خمیر لگا کر جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ خود صدا دینے لگتا ہے کہ دیکھو میرا خالق جتیندر بلو ہے۔ابھی حال ہی میں جتیندر بلو کے افسانوں کا مجموعہ آخری پڑاؤ اس کا بہترین ثبوت ہے۔

آخری پڑاؤ کی اشاعت ۲۰۱۲ء میں عمل میں آئی اس کے بعد بھی ان پانچ سالوں میں جتیندر بلو کی بہت سی کہانیاں میں نے ہندو پاک کے مختلف رسائل میں پڑھی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ فعال ہیں۔ان کے قلم کی روانی ماند نہیں پڑی۔ان کی زندگی کا نومبر اور ڈسمبر ابھی بہت دور ہے۔

آخر میں مَیں عرض کروں گا کہ جتیندر بلو ہو یا ستیہ پال آنند، رتن سنگھ ہو یا نند کشور، گلشن کھنہ ہو یا گوپی چند نارنگ ، نارنگ ساقی ہو یا ٹی آر اینا ہو یا اجئے مالیہ، بلراج بخشی ہو یا کشن کمار طور، ش ک نظام ہو یا راجیش ریڈی، انیل ٹھکر ہو یا دیپک بدکی، رینو بہل ہو یا کرشن بھاوک یہ سب اُردو کے عاشق ہیں' اُردو کی آبرو ہیں' ان کی صحتمندی اور درازی عمر کے لئے میں دُعا گو ہوں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

محمد زبیر

مضمون

پروین شاکر کی غزلوں میں عورت کا نسائی کرب

سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل سدا اس کی انجمن میں رہا

اردو شاعری کے خدائے سخن میرؔ نے غمِ کائنات اور غمِ ذات کے امتزاج سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا اور اس کے نتیجہ میں میرؔ کی آپ بیتی ان اوصاف کی حامل ہوگئی جو کسی بھی شاعری یا فن پارے کو جگ بیتی بنا دیتے ہیں۔ کس طرح کرب ذات کا اظہار معاشرے کی المناک صورت حال کے عرفان کا ذریعہ بن جاتا ہے یہ کوئی میرؔ سے سیکھے۔ ان کی آپ بیتی اگر جگ بیتی بن گئی ہے تو ایسا اس لیے ممکن ہو سکا کہ میرؔ نے غمِ کائنات کو بھی اسی سطح پر محسوس کیا کہ جس سطح پر انسان اپنے ذاتی غم کو محسوس کرتا ہے۔ انھوں نے دنیا کی مشکلات اور آفات کو اپنی شاعری میں اس قدر برتا کہ تمام دنیا کا غم خود ان کا غم معلوم ہونے لگا۔ اس کے برعکس فانیؔ کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے ذاتی غم کو اس قدر پیش کیا ہے کہ خود ان کا غم تمام دنیا کا غم بن گیا۔ اردو شاعرات میں پروین شاکرؔ نے فانیؔ کی اسی شاعرانہ روش کو اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی کو اپنی شاعری میں اس قدر پیش کیا ہے کہ وہ نہ صرف ان کی بلکہ تمام مشرقی خواتین کے دل کی آواز بن گئی ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی، پاکستان میں جنم لینے والی پارہ ادبی دنیا میں پروینؔ شاکر کے نام سے متعارف ہوئیں۔ پروینؔ شاکر ایک ادب شناس گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید شاکر حسین شاعر تھے اور ثاقبؔ تخلص کرتے تھے۔ شاعری کا ذوق پروینؔ نے اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔ اور کالج کے زمانے سے ہی شاعری شروع کر دی۔ ابتداء میں اپنا تخلص بینا رکھا۔ شاعری کی اصلاح نانا سے لی۔ بڑی بہن نسرین بھی شاعری کرتی تھیں۔ گویا کہ شاعری پروینؔ شاکر کو ورثے میں ملی۔

پروینؔ شاکر ایک ذہین طالبہ تھیں، علم و ادب سے گہری وابستگی تھی۔ شاعری ان کا عزیز ترین مشغلہ تھی۔ محنت و لگن سے سب کچھ حاصل کر لینے کا جذبہ تھا۔ ان کا کوئی بھائی نہ تھا، صرف ایک بہن تھی۔ پروینؔ شاکر زندگی کے تمام تر مسائل کا سامنا ہمت و حوصلے سے کرتی تھیں۔ انھیں اپنی استطاعت کا بھرپور اندازہ تھا۔ وہ عورت کو کسی درجہ کمزور تصور نہیں کرتی تھیں۔ یہ نہ صرف داخلی فکر تھی بلکہ کارزار حیات میں بھی وہ اس پر عمل پیرا رہیں۔ خواہ تعلیم ہو یا کہ ملازمت ہر جگہ سربلند رہیں۔ انھوں نے یہ کر دکھایا کہ زندگی کے ہر محاذ پر عورت اپنے وجود کو ثابت کر سکتی ہے۔

پروینؔ شاکر کی زندگی بظاہر تو کامیاب نظر آتی ہے۔ جہاں عزت و شہرت، دولت و ثروت سب کچھ انھیں حاصل ہے۔ لیکن ان کی خانگی زندگی میں ایک تلاطم ہے جو ان کی شخصیت کو ایک نیا پہلو عطا کرتا ہے۔ ابتدائی زندگی میں ایک نوعمر لڑکی کی تمام تر امنگوں کو تسکین حاصل تھی۔ والدین کا لاڈ پیار انھیں ایک اسے جذبے سے سرشار کرتا ہے جس سے ان کے اندر خودی بیدار ہوئی اور جوان کے وجود کا حصہ بن گئی۔ جس کی پاسداری اور احترام ان کا مقصدِ حیات بن گیا تھا اس کا نظر انداز ہونا انھیں کسی قدر گوارا نہ تھا۔ ہر نوعمر لڑکی کی طرح پروینؔ کے اندر بھی ایک مثالی محبوب کا خواب پل رہا تھا۔ جو دنیا کی ساری محبتیں سمیٹ کر اس کی جھولی میں ڈال دے لیکن ایسا نہ ہو سکا، محبوب تو ملا لیکن بیزار، محبت تو ملی لیکن مختصر۔ پروینؔ شاکر کی ازدواجی زندگی بہت عرصے تک کامیاب

نہ رہ سکی، یہ ان کی زندگی کا ایک عظیم ترین سانحہ تھا جس نے انھیں کبھی چین نہ لینے دیا اور ایک ایسے کرب ذات میں مبتلا کر دیا جس سے نکل پانا پروین شاکر کے لیے مشکل تھا۔

پروین شاکر نے اردو شاعری میں نسائی آواز کو سربلندی عطا کی ہے۔انھوں نے صنف نازک کے جذبات و احساسات کو زبان دی، عورت کو مختلف روپوں میں پیش کیا ہے ۔انھوں نے عورت کی زندگی کے تمام تر مسائل کو ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات سے ہم آہنگ کیا ہے ۔ یہ تجربہ گو کہ ان کا اپنا ہے پر یہ معاشرے کا افسانہ بھی ہے۔ جسے انھوں نے انتہائی فطری انداز میں پیش کیا ہے۔خود انہیں کے الفاظ میں:۔

''پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے، آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی ۔۔۔۔۔۔شہر کی اس سنسان گلی تک آپہنچی ہے تو پیچھے دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی ہیں۔ایسا نہیں اس نے اپنے عکس کے وجود کو جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔۔کی۔۔۔۔۔۔پر اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہولہان ہو گئیں!۔۔۔۔۔۔۔۔۔! حیران آنکھوں ،شبنمی رخساروں اور اداس مسکراہٹ وولی اس لڑکی کو اعتراف ہے کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے(اور یہی کیا ،دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو سندر بنا دیتا ہے کہ سنسار کا من موہ لے!) (ماہِ تمام : پروین شاکر صفحہ نمبر ۱۷)

پروین شاکر ایک ایسے عہد میں جنم لیتی ہیں جسے تہذیب کا برزخ کہا جا سکتا ہے جہاں دو تہذیبوں کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔ایک طرف عورت کی زندگی گھر کی چہار دیواری میں محدود تھی تو دوسری طرف عورت اپنے خود کے وجود کو منوانے کی جستجو سے دوچار ہو رہی تھی۔ پروین شاکر نے دونوں سے اثر قبول کیا ہے ۔پروین شاکر نے اپنی غزلوں میں عورت کی خانگی زندگی اور بیرون خانہ اس کے کردار دونوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔ان کی شاعری نے صنف نازک کے جذبات کو زبان دی ہے،ایک نوعمر لڑکی کی تمام تر امنگوں ،ایک عورت کی ازدواجی زندگی کے مسائل ،خود شناسی ،شوہر سے علیحدگی کا کرب یہ وہ مسائل تھے جسے انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلکہ حقیقی زندگی میں بھی برتا ہے۔وہ عورتوں کے مسائل پر بات کرتے وقت اس کے شخصی و انفرادی تقاضوں،جبلتوں ،خواہشوں ،آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار و اعتراف کرنے کے ساتھ ہی اسے مرد کے بغیر نامکمل تسلیم کرتی ہیں۔وہ جدید نسائی ادب کے اس نعرے پر یقین نہیں رکھتیں کہ عورت کو مرد کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ خود اپنے آپ میں مکمل ہے۔وہ مرد کی رفاقت کو عورت کے لیے ضروری خیال کرتی ہیں اور اس سے علیحدگی کو عورت کی سماجی اہمیت اور شخصی و صنفی مقام و مرتبے کے منافی سمجھتی ہیں۔ یہ علیحدگی پروین شاکر کے لیے باعث راحت نہیں بلکہ سامان رسوائی ہے۔اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہیں:۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

عام طور پر مرد کی رفاقت اور اس کی اہمیت کو قبول کرنے کو نسوانی انا کی سر بلندی کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ہماری نسائی تحریکات نے بھی کچھ اسی قسم کا تاثر پیدا کیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت کے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ مرد سے

الگ اور بے تعلق رہ کر زندگی گزارنے کو اپنی کامیاب و کامران زندگی کی ضمانت سمجھے۔ پروین شاکر کی نسائیت اسے قبول نہیں کرتی۔ وہ مرد کے چلے جانے سے عورت کی زندگی میں خلا پیدا ہو جانے کا احساس گہرائی کے ساتھ رکھتی ہیں۔ وہ بحیثیت ایک عورت اس کی واپسی کی منتظر و خواہش مند بھی ہیں۔ ترک تعلق کا کرب انہیں چین نہیں لینے دیتا اور ان کی شاعری کو حزن و ملال کی کیفیت کا حامل بھی بناتا ہے۔

ملنا دوبارہ ملنے کا واعدہ، جدائیاں
اتنے بہت سے کام اچانک نمٹ گئے
وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی

پروین شاکر مرد اور عورت کے وجود کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سمجھتی ہیں۔ ان کی شاعری پر اگر بغور نظر ڈالیے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبوب سے جدائی کو شکست ذات اور اس قربت کو عرفان ذات سے تعبیر کرتی ہیں۔

میں اس ملی تھی کہ خود اپنے سے ملی تھی
وہ جیسے مری ذات کی گم گشت کڑی تھی

اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی بھی قائل ہیں کہ مرد و عورت کا یہ رشتہ باہمی اعتماد اور احترام ذات کی بنیادوں پر قائم ہو۔ وہ نامعتبر رفاقت کو قبول نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے برعکس انہیں پل بھر کی وہ ملاقات عزیز ہے جو باہمی اعتماد و یقین پر قائم ہو۔

تمام عمر کی نا معتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں یقیں سے ملیں

پروین شاکر نے اپنے شعری سفر میں کہیں گھر کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ایک خالص مشرقی عورت کی طرح شریک حیات سے بہر صورت نباہ کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے ان کے پورے شعری سرمائے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترک تعلق کے مقابلے میں شریک حیات یعنی مرد کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار ہیں لیکن اپنے وجود کو تسلیم کیے جانے پر ان کا اصرار بھی ہے۔ وہ سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر بات کرتی ہیں۔

''جذبے کا حسن تو اس کی سچائی ہے اور اظہار کی دلکشی اس کا اعتماد ہے۔ سو یہ لڑکی جب بھی آپ سے بات کرے گی تو اس کی پلکیں بے شک بھیگی ہوئی ہوں گی۔۔۔۔۔۔لیکن ذرا غور سے دیکھیے گا۔۔۔۔۔۔۔۔اس کا سر اٹھا ہوا ہے!'' (ماہِ تمام : پروین شاکر صفحہ نمبر ۱۸)

پروین شاکر نے اکثر جذبوں کو بے حد خوبصورت زبان دی ہے۔ وہ نسوانی مزاج و فطرت سے ہٹ کر کوئی شعری تجربہ نہیں کرتیں۔ اسی لیے ان کے بیشتر اشعار کو پڑھ کر فوراً احساس ہوتا ہے کہ یہ تجربات کسی عورت کے ہیں۔

دکھ سب کے مشترک تھے مگر حوصلے جدا
کوئی بکھر گیا تو کوئی مسکرا دیا
بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

میں جب بھی چاہوں اسے چھو کے دیکھ سکتی ہوں مگر وہ شخص کہ لگتا ہے اب خواب ایسا

پورا دکھ اور ادھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند
زندگی تجھ سے دور رہ کر میں
کاٹ لوں گی جلا وطن کی طرح

پروین شاکر نے اردو کی عشقیہ شاعری کو ایک نئی فکر عطا

کی ہے۔عشق کے تمام مراحل، اظہار محبت، وصل کی چاہت، ہجر کا دکھ، عشق کی پاسداری، جذبات واحساسات کی تپش اور افسردگی کی سرد لہریں جو اسے ٹوٹنے اور بکھرنے نہیں دیتیں ۔پروین شاکر کے یہاں عشق میں ناکامی تو نظر آتی پر اس ناکامی میں مایوسی کی کوئی جگہ نہیں۔ پروین شاکر کا عشق سچا عشق ہے جو جسمانی قرب سے ماورا ہے۔وہ اپنے محبوب کو ٹوٹ کر چاہتی ہیں۔وہ عشق کو جسمانی لذت سے روحانی مرتبے تک لے جانا چاہتیں ہیں جہاں ان کے اور محبوب کے درمیان میں کوئی پردہ حائل نہ ہو، ایک دوسرے کے لیے بے پناہ محبت ہو لیکن یہ محبت دونوں کے وجود کو برقرار رکھتی ہو انھیں عشق کی پاسداری کا بھی خیال ہے وہ عشق کی رسوا نہیں کرنا چاہتیں۔

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
میں اس سے کھل کے ملوں سوچ کا حجاب اترے
وہ چاہتا ہے مری روح کا نقاب اترے
خط کو چوم کر اس نے آنکھ سے لگایا تھا
کل جواب تھا گویا لمحہ بھر سناٹا
کون چاہے گا تمھیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبت کرنا
مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمھاری یاد کے نام انتساب کر دے گا
تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
میں نے جس لمحے کو پوجا ہے، اسے بس اک بار
خواب بن کر تری آنکھوں میں اترتا دیکھوں

پروین شاکر کے یہاں ایک ایسی عورت کا تصور ابھرتا ہے جو اپنے محبوب کو بے انتہا محبت کرتی ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی وہ محبوب سے خود بھی چاہے جانے کی آرزو رکھتی ہے۔لیکن ایسا نہ ہونے پر اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور لہجہ تلخ ہو جاتا ہے۔

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تجھ کو اس سے کیا
بجتے رہے ہواؤں کے در تم کو اس سے کیا
تم نے تھک کے دست میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

پروین شاکر محبت کی پیدا کردہ کیفیت ہجر و فراق کا بیان کرتی ہیں تو لہجے کی نرمی و لطافت اور طبیعت کا حزن و ملال باہم مل کر ایک کیفیت پیدا کر دیتے ہیں قاری اس کرب کی شدت کو بخوبی محسوس کرتا ہے۔یہاں عورت اور مرد کے ہجر و فراق کی منزلیں مختلف ہوتی ہیں مرد فراق کو وصال میں تبدیل کرنے کی سعی کر سکتا ہے پر یہ کام عورت کے دائرہ اختیار سے باہر دکھائی دیتا ہے۔عورت صرف اس مقام پر صرف صبر کرتی ہے۔

وہ کیسی کہاں کی زندگی تھی
جو تیرے بغیر کٹ رہی تھی
وہ ہم نہیں جسے سہنا یہ جبر آ جاتا
تری جدائی میں اس طرح صبر آ جاتا
ہر چیز فاصلے پہ نظر آئی ہے ہمیں
اک شخص زندگی میں ہوا مجھ سے دور کیا
اس بار تو اپنے پاس تھے ہم
پھر کس کے لیے اداس تھے ہم
انگلیوں کو تراش دوں پھر بھی
عادتاً اس کا نام لکھیں گی

پروین شاکر ترک تعلقات کے صرف اپنے محبوب کو ہی موردِ الزام نہیں ٹھہراتیں بلکہ وہ اپنا قصور بھی قبول کرتی ہیں۔

ہم ہی برے ہو گئے کہ تیرا
معیار وفا بدل رہا ہے
ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اس کا ہی قصور سارا کب تھا

پروین شاکر کی آواز ایک ایسی مشرقی خاتون کی آواز ہے جو وفا کی دیوی اور حوصلہ کا پہاڑ ہے جو شرم وحیا کی سرحدوں میں رہتی ہوئی عشق ومحبت کی وہ مثال ہے جو لازوال اور لافانی ہے۔ یہ ایک ایس محبت کی مثال ہے جو حاصل تو کی جاسکتی مگر چھینی نہیں جا سکتی۔

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر
اتنا آسان نہ تھا ورنہ اکیلے چلنا
تجھ سے ملتے رہے اور دھیان سفر پر رکھا
فراق میں ہی رہے ہم تو ساری عمر مگر
چراغ سا کوئی نزدیک جان روشن تھا

اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جا رہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

پروین کو اعتراف ہے کہ بالا دستی ہمیشہ مرد کو ہی حاصل رہے گی۔ تجدید وفا کے لیے جھکنا عورت کو ہی پڑے گا۔

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

پروین شاکر جذبہ عشق کے تحت سپردگی کی قائل ضرور ہیں لیکن نسوانی انا کو برقرار رکھتے ہوئے۔ یہی نسوانی انا ان کی شاعری میں عورت کی زندگی کی ناکامی ونامرادی کا شناخت نامہ بن جاتی ہے۔ پروین شاکر کا یہ انداز ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں ایک اہم مرتبہ اور مقام کا حامل رہا ہے اور جسے ہمیشہ ادب شناس معاشرہ محسوس کرتا رہے گا۔

کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

بیگ احساس

کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

شیخ جبین تاج

مضمون

مثنوی چندر بدن ومہیار کے تاریخی ماٰخذات

تاریخ کے لغوی معنی ''وہ کتاب جس میں بادشاہوں اور مشہور آدمیوں کے حالات اور عہد کے واقعات درج ہوں۔''(فیروز اللغات)''کسی واقعہ اور حادثہ کا علم''(لغات کشوری)اسی طر ح ماٰخذ کے لغوی معنی ''وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز لیں یا نکلے''۔(ایضاً)

گزرا ہوا وقت اور حالات بعد کے دور میں تاریخ بن جاتے ہیں اور آج کی سیاست، مسائل اور اہم واقعات و حادثات کل (آنے والے کل) کی تاریخ بن جاتے ہیں، یہی وقت کا کھیل ہے۔تاریخی ماٰخذات سے مراد وہ وسائل و ذرائع ہیں جن سے کسی چیز کی تاریخیت معلوم ہوتی ہے۔

ماٰخذات کی اہمیت وافادیت: تاریخ میں ماخذات کی بہت اہمیت ہے۔ویسے تو بہت سارے واقعات، قصے اور کہانیوں کا ذکر ہوتا ہے جس کی اہمیت ماخذات کے ذریعہ جانچی جاتی ہے۔حقیقت میں واقعہ کا ہونا یا نہ ہونا ماٰخذات کے بنا پر ہی جانچا جاتا ہے۔

تاریخ میں بہت سارے واقعات، سماجی و معاشی پس منظر، رہن سہن، مذہب، سیاست، جنگ، لباس، زیورات وغیرہ استعمال کی ہوئی چیزوں سے ان کے عہد کا اندازہ لگایا جاتا ہے، کسی گزرے ہوئے واقعات کو ان چیزوں سے جوڑ کر یا ان کی بنا پر حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔انھیں تاریخیت میں ان کا وجود دلانے کے لئے ہم انھیں اس زمانے کی زبان میں موجود مخطوطات یا تصانیف میں موجود اس وقت کے مخصوص الفاظ اور زبان کے ذریعہ یا پھر قدما کی تعمیر کردہ عمارات کے ذریعہ سے اس وقت کو پہچانا جاتا ہے۔

تاریخ دان ہو یا تحقیق کار، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کی حقیقتوں کو آج کے دور میں سچ ثابت کریں۔اس میں ہوتا یہ ہے کہ تحقیق کار اپنے نظریہ کے مطابق کبھی صحیح یا غلط ہو سکتا ہے۔مگر جو تحقیق کار ماخذات کے بنیاد پر کھوج کرتا ہے وہ حقیقت کے قریب ہوتا ہے۔تاریخی واقعات، حقیقی ہیں یا فرضی اگر یہ دریافت کرنا ہو تو ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے، بطور خاص ماخذات کی مدد سے حقیقت کو سامنے لایا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم سے چلے آرہے صدیوں پرانی داستانوں اور واقعات کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ان کی شہرت آج بھی مثال بنی ہوئی ہے، مثال کے طور پر لیلیٰ کے نام سے مجنوں کا نام زبان پر آجاتا ہے ویسے ہی ان کا نام سن کر عربستان کا خیال آجاتا ہے، شیرین فرہاد سے ایران، سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھا سے پنجاب، اور چندر بدن ومہیار کا ذکر سنتے ہی دکن کی یاد آجاتی ہے۔ ان سبھی مشہور زمانہ داستانوں میں دکن کے لازوال قصہ چندر بدن و مہیار کو بار بار لکھا جاتا رہا ہے شاید ہی کسی دوسری مثنوی کو اتنی مرتبہ لکھا گیا ہو۔چندر بدن مہیار کی صداقت کی صدائیں آج بھی گونج کر اپنی داستان سنا رہی ہیں۔اس مضمون میں میری یہ کوشش ہے کہ میں چندر بدن مہیار کے ماٰخذات پر روشنی ڈالوں مگر اس سے پہلے مثنوی چندر بدن ومہیار کے قصے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

چندر بدن ومہیار کے قصے پر ایک نظر:

یہ قصہ عادل شاہی دور میں واقع ہوا تھا اس دور میں سندر پٹن کا راجا رنگراپتی تھا۔ ہندو برہمن راجا دھرم کا پکّا اور اصولوں کا پابند تھا ۔اس راجا کی ایک ہی بیٹی چندر بدن نہایت ہی خوبصورت حسین و

جمیل تھی۔سندرپٹن سے کچھ فاصلہ پر ایک مندر بھی تھا۔راجا سمیت سب اس مندر میں پوجا کرتے تھے یہاں ہر سال میلہ ہوتا اور بازار لگتے اور ہر جگہ سے لوگ آ کر اس میں شامل ہوتے تھے۔

ایک تاجر کا بیٹا مہیار اتفاقاً اس مندر کے پاس پہنچ جاتا ہے یہ دن جاترا کا ہوتا ہے میلے میں چندر بدن کو دیکھ کر عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔مہیار عشق کا اظہار چندر بدن سے کرتا ہے اور وہ اس سے نا اتفاقی کرتی ہے۔مہیار جنگل و بیابان میں در بدر بھٹکتا پھرتا ہے۔بیجانگر کا بادشاہ مہیار کی مدد کرتا ہے اور اس کو مندر کے پاس لے آتا ہے اتفاق سے ایک سال بعد یہ دن جاترا کا ہوتا ہے ۔بادشاہ راجا رانگراپتی کے پاس قاصد بھیجتا ہے کہ چندر بدن کا بیاہ مہیار سے کرے اور راجا اس بات سے صاف انکار کر دیتا ہے۔چندر بدن کو دیکھ کر مہیار دوڑ کر اس کے قدموں میں جا گرتا ہے مہیار کو اس حال میں دیکھ کر غیض وغضب کے عالم میں کہتی ہے ''تو ابھی تک زندہ ہے'' اتنا سننا ہی تھا کے چندر بدن کی بات پر مہیار جان بحق ہو جاتا ہے۔

مہیار کا جنازہ قبرستان لے جایا جاتا ہے جنازہ آگے نہیں بڑھتا سندرپٹن پہنچ کر رنگراپتی کے در پر اڑ جاتا ہے۔جب چندر بدن کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ اسلام قبول کر کہ اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور پھر سفید چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ جاتی ہے، جنازہ آگے بڑھ جاتا ہے قبرستان پہنچ کر دفن کرنے کے لئے جنازہ پر سے چادر ہٹایا جاتا ہے کفن میں مہیار اور چندر بدن ہم آغوش پا کر ان کو الگ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور آخر کار دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر کہ اس پر دو تعویذ بنا دیا جاتا ہے۔

تاریخی ماخذات:

گوپی چند نارنگ نے اس قصہ کی تاریخی حیثیت کو مشتبہ بتایا ہے۔دکنی مورخین میں سید نور اللہ نے ''تاریخ عادل شاہیہ'' اور شاہ تجلی علی تجلی نے ''توزک آصفیہ'' میں اس واقعہ کی اصلیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اکبر الدین صدیقی نے اپنی کتاب مثنوی چندر بدن ومہیار میں لکھا ہے کہ ''یہ مقام مدراس سے شمال مغرب میں ۸۰ میل دور آج بھی موجود ہے''۔(چندر بدن ومہیار مقدمہ:ص۔۳۵) نصیر الدین ہاشمی کہتے ہیں ''علاقہ مدراس کے ایک قصبے میں ان دونوں کی قبر موجود ہے اور زیارت گاہ عام ہے''۔(دکن میں اردو، طبع ثالث ص۔۱۲۶)

چندر بدن مہیار کا مزار:

آندھرا پردیش کے ضلع انت پور کا ایک منڈل شہر کدری ہے۔کدری میں واقع سرکاری دواخانہ کے روبرو مسلمانوں کا قبرستان ہے اس میں چندر بدن ومہیار کا مزار آج بھی موجود ہے۔ان کا مزار ہی کدری کے قبرستان کا سب سے پہلا مزار ہے۔ہر جمعرات اور جمعہ کے دن اس کی زیارت کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور مزار کی مٹی لے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی میں نا اتفاقیوں کو دور کرنے کے لئے اس مٹی کو پانی میں گھول کر پلا دیں تو دونوں میں مودت پیدا ہو جاتی ہے۔

چندر بدن ومہیار کا مزار

ذیل میں چندر بدن ومہیار کے مزار کی تصویر دی گئی ہے جس پر دو تعویذ ہیں ایک تعویذ (بائیں جانب) مردانہ ہے اور دوسری (دائیں جانب) زنانہ اور ان کے مزار کی تختی ہے جس پر ایک شعر لکھا ہوا وہ یہ ہے۔

روضۂ چندر بدن ومہیار   کتبہ روضۂ چندر بدن ومہیار

جب جلوہ نما ہوئے چندرودنا مطلق   ذرہ نہ رہا باقی مہیار کی ہستی
کا (کتبہ)

اس جڑواں تعویذ کا ذکر باقر آگاہ نے اپنی مثنوی "ندرت عشق" اور واقف نے اپنی مثنوی "بوستان عشق" میں کیا ہے متعلقہ اشعار درج ذیل ہیں۔

اشعار:

ان دونوں کو ایک قبر میں دفن کر کے
بنائے دو تعویذ اس کے اوپر
(باقر آگاہ)

بندھے یک قبر پر تعویذ جب دو
نشانی ہر کسے معلوم تا ہو
(واقف)

نرسمہا سوامی کا مندر کدری:

کدری میں ایک بڑا مندر ہے جو نرسمہا سوامی کا مندر کہلاتا ہے۔ یہ وہی مندر ہے جس میں چندر بدن عبادت کے لئے آیا کرتی تھی اس مندر میں تفریح کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اس مندر کے اندر داخل ہونے کے لئے چار دروازے بنائے گے ہیں، ہر ایک دروازہ الگ الگ فرمانرواؤں نے بنوایا ہے ان میں سے ایک گوپورم (گنبد) مسلم حاکم نے ٹیپو سلطان کے عہد میں بنوایا تھا۔ سری کرشنا دیورائے نے ۱۵۲۹ء میں اور چالوکیہ خاندان کے دوسرے راجاؤں نے اس مندر کا دورہ کیا ہے۔ اس مندر کی بنیاد سندر پٹن کے راجا رنگراپتی نے رکھی تھی۔ اس راجا کا ذکر مقیمی اور

نرسمہا سوامی کا مندر۔کدری

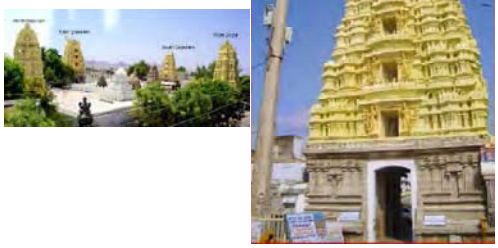

دوسرے شعراء نے اپنی اپنی مثنویوں میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

اشعار:

بھرے تھے خلق سے یوں دیر کدری
نہ کوئی تھا جہاں میں غیر کدری
کہ اس بستی میں یک دیول بڑی ہے   وہ دیکھو ابتلک قائم کھڑی ہے
(واقف)

سنیا ہوں کہ کہتے ہیں سندر پٹن   اتھا راج واں ایک ہندو برن
کہ راجاں میں اوراج جگ راج تھا   کتیک ملک کا اس کوں خوش باج تھا
اتھے بھوت کیراں واں یک دیر تھا   پرستش کوں واں سب بشر سیر تھا
کریں راج پوجا اسی دیو کا   تماشا عجائب دسے سیو کا
(مقیمی)

جاترا:

ہر سال مارچ کے مہینے میں اس مندر کی جاترا ہوتی ہے پہلے دس دن میں دیو کی پوجا اور دوسری رسمیں انجام دی جاتی ہیں جاترے کے گیارہویں دن رتھ کھینچی جاتی ہے ،اس میں شامل ہونے کے لئے لوگ جوق در جوق دور دور سے چلے آتے ہیں۔آج بھی یہاں کی روایت یہ ہے کی رتھ کو کھینچنے سے پہلے یہاں پر عالم خاں ولی بابا کی درگاہ شریف کو بھتہ یعنی نیاز (چاول،دال ، گُڑ، پھوٹانے وغیرہ) پیش کیا جاتا رہا ہے ان کا یہ ماننا ہے کی اگر یہ رسم ادا نہیں کی جائے تو رتھ آگے نہیں بڑھتی بلکہ ایک ہی جگہ تھم جاتی ہے کدری میں یہ رسم آج بھی پائی جاتی ہے۔یہ درگاہ بھی سات سو سال پرانی ہے۔اس جاترا کے دنوں میں ''دھونم'' ایک قسم کا پتہ جو خوشبو کے لئے مشہور ہے رتھ کو سجانے میں استعمال کیا جاتا ہے یہ پتہ انہی دنوں میں دستیاب ہوتا ہے اور سال میں ایک ہی بار حاصل ہوتا ہے۔

جاترا میں رتھ کھینچتے ہوئے

چندر بدن کی آمد و رفت کا راستہ (سرنگ) :

زمین کے اندر کے راستے کو سرنگ کہتے ہیں۔بادشاہوں کی آرامگا ہوں یا محل پر اچانک حملہ ہونے پر ،بادشاہ وامراء ان خفیہ راستوں کے ذریعہ جان بچا کر باہر نکل جاتے تھے۔ان کا استعمال کی مقاصد کے لیے کیا جاتا تھا۔

۱) کدری کی سرنگ: کدری میں ایک سرنگ پائی جاتی ہے۔ یہ وہی سرنگ ہے جس کے راستے چندر بدن اپنی ۷۰۰ سہلیوں کے ساتھ مندر آیا کرتی تھی۔ یہ سرنگ آج بھی اس مندر میں موجود ہے اور مندر کے اندر کی جانب والے احاطہ میں ہے اس پر ایک چھوٹا دروازہ لگا کر مقفل کر دیا گیا ہے۔

اس زمانے میں جب جاترا میں ہزاروں جاتری جمع ہوتے کسی کو بھی کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ چندر بدن کہاں سے اور کس راستہ سے مندر آیا کرتی تھی۔ چندر بدن اچانک سے نظر آتی اور پھر یکا یک غائب ہو جاتی تھی۔ چندر بدن اِسی خفیہ راستے (سرنگ) سے مندر کے پاس نکلتی اور پوجا پاٹ کر کے اسی راستہ سے واپس گھر چلی جاتی تھی۔اس کا علم کسی کو بھی نہیں تھا۔اس کے اس طرح راز داری سے آنے اور جانے کا ذکر اشرف گجراتی اور مقیمی نے اپنی مثنویوں میں اس طرح کیا ہے۔

نرسمہا سوامی کے مندر میں موجود سرنگ۔کدری

اشعار:

یکا یک وہ نکلی جوان کی طرف
نگہ سیں دیا اس جوان کو شرف (اشرف گجراتی)

یکا یک جوں نکلی وو گھر تے بہار
لٹکتی جو آئی اپیں گل عذار (مقیمی)

۲)سندر پٹن کی سرنگ: اس سرنگ میں اندر جانے کے راستے کی شناخت اوراسے پہچاننے کے لئے سرنگ کی دائیں جانب دوسانپ اور بائیں جانب ہندو دیوتا گنیش کی تصویریں پتھر پر تراشی گئی ہیں۔جس کا مقصد سرنگ کے اندر داخلے کے راستے کی نشاندہی تھا۔

سندر پٹن کی سرنگ پر موجود تصویریں

سندر پٹن کے سنگی ستون :

سندر پٹن کے علاقے میں دو سنگی ستون ہیں۔یہ وہی دو پتھر ہیں جہاں مہیار کا جنازہ چندر بدن کے محل کے دروازے پر اڑ گیا تھا۔باقی سارا محل ٹوٹ پھوٹ کر چٹیل میدان ہو گیا ہے۔نشان کے طور پر یہی دو پتھر باقی رہ گئے ہیں۔

یہ وہی سنگی ستون ہیں جہاں پر مہیار کا جنازہ اڑ گیا تھا

اشعار:

سنی یو خبر جوں کہ چندر بدن
کہ اٹکیا جنازہ اپس گھر کدھن
دیکھیا شاہ، تدبیر چلتا نہیں
جنازہ یہاں تے نکلتا نہیں (مقیمی)

اختتام :

اس مثنوی کو کئی شعرا نے اپنے اپنے انداز میں قلم بند کیا ہے،جن نامور شعراء نے چندر بدن ومہیار کے بارے میں لکھا ہے، ان کے نام یہ ہیں مقیمی،بلبل،بابا چندا حسینی واقف،باقر آگاہ،سیف اللہ،عبدالقادر شاکر وغیرہ۔ان سبھی مثنویوں میں واقعہ تقریباً ایک ہی ہے لیکن جزئیات میں ایک دوسرے سے فرق نظر آتا ہے۔ان تمام مثنویوں میں ان مقامات کا ذکر اور اس واقعہ کا وجود ملتا ہے۔

میری تحقیق کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ اب تک جتنے بھی شعراء نے چندر بدن ومہیار کے قصے پر مثنویاں لکھی ہیں کسی نے اسے فرضی جانا ہے تو کسی نے حقیقی۔لیکن چند شعراء کو چھوڑ کر باقی سبھی نے جہاں یہ واقعہ پیش آیا اس مقام کا نام کدری (قادر) یا سندر پٹن بتایا ہے۔نیز راقمۃ الحروف نے اس جگہ پر جا کر تحقیق کر کے ثبوت کی بنا پر یہ تصویریں پیش کی ہیں۔

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200روپے

-/800طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی

www.ephbooks.com

یادیں

شاید یہی ہے اندر پرستھ ہے
وقت کی لہروں سے اُبھرے
بے حساب دلفریب
خوب صورت تحریروں سے جنہیں کبھی پیار نہیں رہا
لیکن من چاہے ڈھنگ سے تاریخ کو پھلانگتی رہی پر نتو
آنے والی نسلوں سے ان کی پہچان بنی
کئی کئی دیو مالائی کہانیاں اپنے من مندر میں سجائے
اگر یہ ہستناپور نہیں ہے تو پھر کیا ہے
شاید یہی اندر پرستھ ہے
مگر ہمیں وہیں جانا ہے
جہاں سے ہمیں کوئی پکارتا ہے
جہاں سے ہمیں کوئی بلاتا ہے
نہ جانے کیوں
ارے! ارے دیکھو تو جل رہی ہے
ہجر کی آگ میں
یگ آریاؤں کے دور کی ایک اچھوتی چمکتی ہوئی خاص روایت میں
جکڑی
ہمالیہ کی بلندیوں میں دیو مالائی کتھائیں کتنی ہی چھپی ہیں
جو سچ یگ سے بیوپار تک
لیکن یہ عجیب کل یگ میں کتھاوں سے آگے
کبھی کبھی یہ ہمیں تھوڑی سی جھوٹی تسلی دیتے ہیں کسے؟
بزدل جنتا کو
کروار ہے ہیں پنچال نریش درپد
مگر مشکل ہے کہنا
اس ان جانے یگ میں
اس یگ میں کنڈ سے
اٹھتی ہوئی لپیٹوں میں ہے وہ اگنی
یعنی دروپد کے من سے اٹھتی
ایمان کے احساس میں لپٹے ہوئے شعلے
تیز اور تیز ہوتی لپٹیں
تیز اور تیز ہوتے ہوئے افکار
سامنے آرہا ہے ایک من موہن پتر دشت.....
لو جنم لی سے جھلکتا ہوا روشن
لو پھر اٹھی آگ کے شعلوں سے اوپر
ایک وفادار استری کی مورت
بہت ہی خوب صورت
سرو جیسی بلند قامت
کمل جیسی حسین نرم من موہنی
کیلے کے پیڑ جیسی سڈول بدن، جھانگیں
ذہن چمکدار بڑی بڑی ہرنیں جیسی چنچل آنکھیں
ایسا لگتا ہے جیسے خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے
خود ہی بنایا ہو
اس حسن کی مورتی پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی
گھنے امنڈتے ہوئے کالے کالے بادل جیسے بال

جن کی گھنگھور گھٹاؤں میں ہوا بھی گم ہو جاتی ہے
بدن میں ہلکی ہلکی بھینی بھینی خوشبو
جس کی خوشبو بھونرے کو بھی للچاتی
اس کی خوبصورتی کو دیکھنے اگنی کے شعلے اٹھ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے
ساکت خاموش
وقت بھی تو اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا گویا ٹھہر گیا
گمبھیر سروں میں گونجتی ایک آواز آئی
دروپدی کی دلی آرزو بر آئی
ایک آکاش وانی نے یہ خوش خبری سنائی
وقت کے برخلاف
دوڑ رہا امیدوں کے پر لگائے
اڑتا جا رہا ہے ہوا پر گھوڑا
آگے یا پیچھے ماضی یا مستقبل
یا بہتے لمحے شاید پھر لوٹ رہے ہیں
آہ واہ بغیر رُکے بغیر دم لیے چلا آ چلا آ
مگر یہاں کہاں اندر پرستھ ہے
یہ تو پانچال دیش ہے
دروپدی کی راجدھانی سجی ہے
سوئمبر کے لیے سبھا سجی ہے
یہاں آئے ہیں دور دور سے
نامی گرامی ویر مہابلی راجے مہاراجے مہا پرتابی
روپ میں ایک سے آگے ایک
گیان میں ایک سے بڑھ کر ایک
کسی کے لیے کرشن
کسی کے لیے یدسینی
کسی کے لیے پنچالی
تو کسی کے لیے دروپدی
دروپدر اجکماری
کھڑی ہے ہاتھ میں لیے ورمالا
پہلو میں کھڑے ہیں بھائی دریودھن
کیا وہ مجھے پہچان پائیں گی
کیا کوئی اور بھی مجھ جیسا ہوگا
نہیں نہیں ہاتھی نہیں
گھوڑا لے کر جاوں گا
راجکماری کو ساتھ لیے
دو یار سے کل یک چھلانگ لگاتا اُڑتا جاوں گا
جہاں دروپدی وہیں اندر پرستھ
اندر پرستھ کی شروعات دروپدی
اندر پرستھ کا انت دروپدی
وقت کی سیج پر اپنی محبوبہ کے سنگ
کلپ ورش کے جھرمٹ میں
اپنی محبوبہ کو آغوش میں لیے سو جاوں گا
آنند ہی آنند
سونا بن جاوں گا
کلپ ورش سے جو مانگو ملتا ہے
میں انسان ہوں
کیا چاہوں گا سوائے پریم کے
کیا مانگو سمئے سے ڈر بھی لگتا ہے

☆☆☆

طنز و مزاح

اردو ادب کے مہاراج کتھک

ڈاکٹر انور سجاد جیسی ہمہ جہت شخصیات اردو ادب میں کم ہی ہوں گی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر ہیں ان کے وقت کا خاصا حصہ مریضوں کی بیماریوں سے نبرد آزما ہونے میں گزرتا ہے۔ فرصت کا جو وقت ملتا ہے، اس میں وہ خود بیمار پڑ جاتے ہیں۔ یعنی ادب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی لیتے ہیں۔ انھوں نے ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی لیکن اس بھاری پتھر کو چومے بغیر ہی چھوڑ دیا کیوں کہ بہ حیثیت ڈاکٹر انھیں معلوم تھا کہ پتھر ہی کو نہیں، کسی بھی بے جان چیز کو چھوا جائے تو اس کی طرف سے کوئی ردّعمل ظاہر نہیں ہوتا۔

شاعری پہ بس نہ چلا تو افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ اس وقت سعادت حسن منٹو زندہ تھے، افسانہ لکھ کر انھیں دکھایا، انھوں نے بغیر دیکھے اپنے پاس رکھ لیا اور کہا، یہی افسانہ دوبارہ لکھ کر لاؤ۔ یہ دوبارہ لکھ کر لے گئے۔ منٹو نے پھر وہی سلوک کیا اور افسانہ تیسری مرتبہ لکھوایا۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور جب انور سجاد نے بائیسویں مرتبہ افسانہ لکھ کر پیش کیا تو منٹو نے کہا، میں تمھیں افسانہ نگاری سے باز رکھنے کے لیے ایک ہی افسانے کو بار بار لکھوا رہا تھا، مگر تم میرا مقصد نہیں سمجھے لہٰذا اب تمھاری سزا یہ ہے کہ افسانے لکھتے رہو۔ اور یوں انور سجاد کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا اور اس میدان میں انھوں نے خاصی شہرت حاصل کی اور داد بھی سمیٹی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں اردو افسانے کا معمار اعظم قرار دیا۔ لوگوں نے اس رائے کو فاروقی کی تنقیدی سخاوت سمجھا۔ انور سجاد نے بھی سخی کے خزانے سے ملی ہوئی دولت کو ''حوصلہ افزائی'' کا نام دے کر قبول کر لیا۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فاروقی کی رائے اردو افسانے کی تنقید میں کتابت کی ایک سنگین غلطی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کیوں کہ بعض نقادوں کی تحریریں کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بامعنی ہی نہیں، زیادہ بامعنی ہو جاتی ہیں۔

افسانہ نگاری سے انور سجاد کو جو شہرت ملی، وہ معاصر افسانہ نگاروں اور نقادوں تک محدود رہی۔ عام لوگوں سے ویسی ہی مغائرت رہی جیسی دو اجنبیوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن مغائرت کا یہ پردہ اس وقت ہٹ گیا جب انور سجاد نے ٹی وی ڈراموں میں اداکاری شروع کی۔

وہ ایک عرصے تک ٹی وی کے ڈراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے اور ان کا شمار بہترین اداکاروں میں ہوتا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں اس کام سے ان کا یا ٹی وی والوں کا دل بھر گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اداکاری کے ذریعے جس سرعت سے شہرت حاصل ہوئی تھی، اسی سرعت سے زائل بھی ہو گئی۔ اداکاری کی دنیا میں شہرت صرف اس وقت تک ساتھ دیتی ہے، جب تک اداکار سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ جوں ہی وہ منظر سے ہٹتا ہے، شہرت داغ مفارقت دے جاتی ہے۔

انور سجاد کو رقص اور موسیقی سے بھی گہری دلچسپی رہی ہے، جن لوگوں نے انھیں بقول جوشؔ، اعضا کی شاعری کرتے دیکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر انور سجاد صرف اسی فن کے ہو کر رہ جاتے تو وہ مہاراج غلام حسین کتھک سے بھی بڑے رقاص ہوتے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ بعض اہلِ نظر کو خود مہاراج کے

بڑے رقاص ہونے میں شبہہ ہے)

جنھوں نے انور سجاد کی پینٹنگز دیکھی ہیں، ان کا خیال بھی کچھ اسی قسم کا ہے، یعنی اگر موصوف اپنے آپ کو صرف مصوری کے لیے وقف کر دیتے تو ان کے سامنے پکاسو کی وہی حیثیت ہوتی جو افسانے میں منٹو کے سامنے خود انور سجاد کی ہے۔

انور سجاد کو سیاست سے بھی دلچسپی رہی ہے اور اس سلسلے میں وہ کچھ دنوں کے لیے قید و بند کی سختیاں بھی برداشت کر چکے ہیں۔ مگر ڈراموں میں سختیاں برداشت کرنے کی مشق عملی زندگی میں کام نہ آئی، اس لیے انھوں نے بہت جلد کوچہ سیاست سے راہِ فرار اختیار کر لی۔ عملی سیاست سے وہ تائب تو ہو گئے لیکن نظریاتی دلچسپی باقی رہی جس کا اظہار ان کی ادبی تحریروں میں ہوتا رہا۔ اس سلسلے میں ان کا ناول ''جہنم روپ'' بڑی اہمیت رکھتا ہے جو انھوں نے بھٹو کی پھانسی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ناول میں بھٹو تو پھانسی کے تختے پر نظر نہیں آتے، البتہ ناول نگاری کے فن کو پھانسی لگتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمیں اس سنگ دلانہ رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس ناول میں انور سجاد نے علامتوں اور استعاروں میں بات کی ہے۔ علامتوں اور استعاروں سے مفہوم اخذ کرنے کے لیے خاص ذہنی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اردو کے عام قارئین عموماً محروم ہوتے ہیں۔ جن معدودے چند افراد کے پاس یہ صلاحیت ہے، ان کا خیال ہے کہ انور سجاد علامتیں اور استعارے نہایت ہنر مندانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مفہوم اپنے ہی پاس رکھ لیتے ہیں تاکہ مطالعے کے دوران قاری محنت و مشقت سے کام لے کر یہ جاننے کی کوشش نہ کرے کہ مصنف نے زحمت تحریر کیوں اٹھائی ہے۔ اردو کے تن آسان قاری کو محنت و مشقت کی طرف مائل کرنا، کتاب لکھنے سے زیادہ مفید کام ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ان کے مقلد ساختیاتی نقادوں کے لیے انور سجاد کی تحریریں نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہیں، کیوں کہ ان سے حسب منشا معنی برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ معنی برآمد نہ بھی ہوں، ساختیاتی تنقید کے اصولوں کو تو منطبق کیا ہی جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ کسی تحریر میں معنی کا پایا جانا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے نقاد کو پولیس والوں کی طرح بے گناہ لوگوں سے مال مسروقہ برآمد کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

ادب اور فنون لطیفہ کے اتنے بہت سے شعبوں میں نام پیدا کرنے والے انور سجاد گزشتہ کئی برسوں سے منقار زیر پر ہیں۔ ان کی کوئی کتاب شائع ہوئی ہے اور نہ رسالوں ہی میں ان کی تحریریں نظر آتی ہیں۔ اب وہ سابقہ شہرت کے حوالے سے نظروں میں رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے ٹی وی سے ان کا ایک انٹرویو ٹیلی کاسٹ ہوا تھا اور ایک انٹرویو پچھلے ہفتے اخبار ''جنگ'' کراچی میں شائع ہوا ہے۔ اسی انٹرویو کو پڑھ کر ہمیں کالم لکھنے کا خیال آیا ہے۔ انور سجاد ہمارے محبوب افسانہ نگار اور اداکار ہیں، انھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔

اس انٹرویو میں انور سجاد نے اپنے بارے میں بہت سے دلچسپ اور سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔ منٹو والے مذکورہ بالا واقعے کا مرکزی خیال ہم نے اسی انٹرویو سے اخذ کیا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جب انور سجاد نے اپنی پہلی کہانی حلقہ ارباب ذوق میں سنائی تو ان کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ آگے کا قصہ انور سجاد ہی کی زبان میں یہ ہے ''انیس ناگی اور افتخار جالب نے میری بڑی حمایت کی مگر یہ دونوں خود اس زمانے میں معتبر قرار نہیں پائے تھے

لہٰذا ان کی حمایت پر کون متوجہ ہوتا، میں اس تنقیدی رویے سے دل برداشتہ نہ ہوا بلکہ فیصلہ کرلیا کہ ایسے ہی لکھوں گا جس طرح جو بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، اسی طرح اظہار کروں گا۔ میرے اس رویے پر مجھے پاگل کا خطاب دیا گیا''۔

جیالوں کو آج کل ستارہ امتیاز قسم کے خطابات ملتے ہیں، حیرت ہے کہ انور سجاد جیسے بلند مرتبہ دانش ور کو ایسا نامعقول خطاب ملا۔ غیر شائستہ خطاب دینے والوں کی عقل کا ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ ہم اس بات پر بھی اظہار افسوس کریں گے کہ انور سجاد نے انیس ناگی اور افتخار جالب کو غیر معتبر قرار دیا (اگرچہ انھوں نے ''اس زمانے'' کی قید لگا دی مگر بڑے ادیب قید زماں سے آزاد ہوتے ہیں)۔ کوئی دوسرا اس خیال کا اظہار کرتا تو اور بات تھی لیکن کم از کم انور سجاد کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا کیوں کہ انیس ناگی اور افتخار جالب کے غیر معتبر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی اور ہے کہ ان دونوں نے ہمیشہ انور سجاد کو ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا اور اسے انتظار حسین سے بڑا افسانہ نگار ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ان دونوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا مقدمہ کمزور تھا لیکن ایسی کوششوں کو کامیابی یا ناکامی کے پیمانے سے نہیں ناپا جاتا، صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوشش کرنے والا اپنے مقصد سے کس حد تک مخلص تھا۔ افسوس کہ انور سجاد نے خلوص کی قدر نہ کی! ایسی ہی باتوں کی وجہ سے چند برس پہلے انیس ناگی نے لاہور کے اخبارات میں انور سجاد کے نام ایک کھلا خط شائع کیا تھا جس میں اور بہت کچھ کہنے کے علاوہ یہ احسان بھی جتایا تھا ''میں بیس برسوں سے تمھارا قلم دان اٹھائے پھرتا رہا ہوں اور تمھارے ان ادبی حریفوں کو پچھاڑتا رہا ہوں جو تمھیں اداکار تو مانتے ہیں لیکن تمھاری ادبی حیثیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں''۔

اب نہ ادبی حریف رہے نہ اداکاری، نہ ادبی حیثیت، بس شک کی نگاہ سے دیکھنے والے رہ گئے ہیں۔ خدا ان کے دیدہ مشکوک کو یقین کی روشنی عطا کرے!

انور سجاد نے اپنے انٹرویو میں بار بار اس پر اصرار کیا ہے کہ انھیں عظیم بننے کا شوق نہیں ہے۔ یہ تبدیلی حیرت انگیز ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو موصوف اپنے آپ کو عظیم سے بھی کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے یعنی یہ کہتے تھے کہ میں عہد ساز ہوں۔ اس کا دستاویزی ثبوت بھی موجود ہے۔ انور سجاد کے مجموعہ مضامین ''تلاش وجود'' میں کشور ناہید پر جو مضمون ہے، اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں ''ایک عرصے سے میری بڑی خواہش رہی ہے کہ میں اپنے عصر کی تین عہد ساز شخصیتوں پر ..... ایک زبردست پُر مغز مضمون لکھوں۔ ان کی ذاتی زندگی اور ان کے فن کی تفصیلات و جزئیات کا ایسا زبردست تجزیہ کر کے احاطہ تحریر میں لے آؤں کہ ان کی ذاتی زندگی اور تخلیقات کے درمیان دوئی کے نقش مکمل طور پر مٹا دوں یا مکمل طور پر واضح کر دوں اور یوں ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔ ان تین شخصیتوں میں ایک عہد ساز شخصیت میں خود ہوں لیکن اس سلسلے میں جب بھی قلم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو میری روایتی کسر نفسی آڑے آجاتی ہے۔ دوسری عہد ساز شخصیت میرا دوست بلراج مین را ہے کہ جس کا میں نے ہمیشہ بھلا چاہا ہے۔ تیسری عہد ساز شخصیت کشور ناہید ہے کہ جس کا میں دوست ہوں اور جس نے ہمیشہ میرا بھلا چاہا ہے''۔

اپنے آپ کو عہد ساز کہنا اور عظیم بننے کا شوق نہ رکھنا، دو متضاد باتیں ہیں۔ یہ تضاد اسی وقت دور ہوسکتا ہے جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ''عہد ساز'' کی ترکیب ''زمانہ ساز'' کے معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔

☆☆☆

شاعری

غزلیں

آغا سروش

نیند آتی نہیں تھی جنہیں بستر کے علاوہ
سر دھرنے کو اب کچھ نہیں پتھر کے علاوہ

اس شہر میں رہتی بھی کہاں جا کے شب غم
ہر گھر میں چراغاں تھا مرے گھر کے علاوہ

یوں لٹ گئے ہم دشتِ تمنا کے سفر میں
سر پر نہیں کچھ دھوپ کی چادر کے علاوہ

گر اس کو پہن لینے سے مل جاتی ہے عزت
لیجا مری دستار مرے سر کے علاوہ

تو جیت نہیں پائے گا کردار سے میرے
کیا اور ترے پاس ہے لشکر کے علاوہ

چڑھ کر سرِ نیزہ مرا سر دیکھ رہا ہے
خوں ہے مراکس ہاتھ پہ خنجر کے علاوہ

ہوں خون میں ڈوبے ہوئے جس تخت کے پائے
کیا اس کی ہے قیمت مری ٹھوکر کے علاوہ

آنسو مرے ہوتے جو ترے غم کے برابر
کچھ ہوتا نہ دنیا میں سمندر کے علاوہ

دلہن تھی پہ سمٹی ہوئی چادر میں حیاء کی
زیور نہ تھا کچھ حسن کے زیور کے علاوہ

دربار میں تو سب کی زبانوں پہ تھے نالے
حق گو کوئی نکلا نہ سخنور کے علاوہ

کیا دین کا اب کوئی مددگار نہیں ہے
جز تین سو تیرہ کے بہتر کے علاوہ

آنکھیں ہیں سروشؔ اپنی یہاں روزنِ زندان
دکھتا نہیں اب خوں بھرے منظر کے علاوہ

شاعری

غزل و نظم

اشرف رفیع

تمہارے ذکر میں پہلی سی دل کشی نہ رہی
خدا کا شکر ہے اب تم سے دوستی نہ رہی
نہ قیس ہی رہا کوئی نہ تیشہ زن کوئی
بدلتے وقت میں وہ رسم عاشقی نہ رہی
سحر سے شام ہوئی، شام کی سحر نہ ہوئی
چراغ جلتے رہے ان میں روشنی نہ رہی
اٹھی ہیں صحن میں جب سے یہ اونچی دیواریں
ہمارے گھر میں وہ پہلی سی چاندنی نہ رہی
کچھ اس طرح سے ملا کل وہ شخص محفل میں
اب اسی سے ملنے کی امید اور بھی نہ رہی
وہاں اُگ آئے ہیں چھوٹے بڑے مکان کئی
جو بیچ شہر سے بہتی تھی وہ ندی نہ رہی
جو راہبر تھے ہمارے وہ نقش پا نہ رہے
وہ راہبر نہ رہے اور وہ رہبری نہ رہی
اٹھے جو صبح سرہانے رکھا رہا دیوان
مشاعروں میں ہیں استاد، شاعری نہ رہی
سوائے رقص کے سب کچھ ہے کیا کہیں اشرفؔ
مشاعروں میں وہ تہذیبِ واجبی نہ رہی

یہ شیخ یہ برہمن
کیوں سوچتے ہیں کل کی
کل سے ڈراتے کیوں ہیں
کل دیکھا ہے کسی نے
کل آئے یا نہ آئے
ہے آج اب سبھی کچھ
اس کا ہر ایک لمحہ
وہ بھی تو اڑ رہا ہے
وہ بھی گزر رہا ہے
جیسے کہ موج دریا
جیسے ہوا کا جھونکا
جیسے شہاب ثاقب
جیسے گزرتی سانسیں
جیسے نظر کی شوخی

چاہوں جو ایک لمحہ
مٹھی میں اپنی پکڑوں
آنچل میں اپنے باندھوں
وہ لمحہ جس نے مجھ کو
یہ حوصلہ دیا ہے
مر مر کے جی رہی ہوں
جی جی کے مر رہی ہوں

شاعری

غزلیں

خالدعبادی

کج کلاہی کا کوئی مطلب نہیں تھا
میں نہیں تھا تو مرا مذہب نہیں تھا

کاملِ بے مکتبی ہوکر اٹھا میں
یہ نہیں کہ دہر میں مکتب نہیں تھا

صحبتِ رفتہ تھی اس خود رفتگی میں
جس میں تیرا دھیان بے مشرب نہیں تھا

سوچنے والے تری حیرت فزوں ہو
میں وہاں پہنچا جہاں منصب نہیں تھا

ساربانِ قیس سمجھاتا ہے مجھ کو
وہ تو نخلستان تھا یثرب نہیں تھا

منزلیں سب قرب کی طے ہو چکیں تو
سامنے وہ چشمۂ اقرب نہیں تھا

پھر گیا میں اس لیے سردادگی سے
تیغۂ دنیا مجھے انسب نہیں تھا

خیمۂ شب قصۂ افسوس ہوتا
رو میں جوہر تاب کا اشہب نہیں تھا

زندہ رہیں گے بعض تو مر جائیں گے کئی
کچھ بے خطر پھریں گے تو ڈر جائیں گے کئی

آنے کا سلسلہ ہی لگاتار کیوں رہے
اب ہو ہی یہ رہے گا کہ گھر جائیں گے کئی

اس شہر بے ربا میں توطن نہ کر قیاس
جھپکی ذرا سی آنکھ مکر جائیں گے کئی

سینہ کو ایک قطرۂ دل کا خیال کیا
تھوکے کو تیرے چاٹ نکھر جائیں گے کئی

دستِ دعا دراز کرے قلبِ اشقیا
سرتاج مثل خاک بہ سر جائیں گے کئی

اپنا شمار آپ عبادی انہی میں کر
جائیں گے اور وہم کدھر جائیں گے کئی

نظمیں

اکرم نقاش

بابِ فضل کا انتظار

بڑی پُر ہول ہیں یہ تصویریں
بڑی جاں سوز ہیں یہ آوازیں
جگر کے پار اُترتے ہوئے یہ خنجر ہیں
دلوں کو چیر کے رکھ دینے والے منظر ہیں
اب ہر طرف غم واندوہ کے نظارے ہیں

مرے خدا!
یہ تہی دست بے اماں بندے
تری پناہ کے طالب
اُٹھائے طوق مظالم کے
باروحشت کے
کھڑے ہیں
کب سے اس امید پر
ترے آگے
کہ بابِ فضل کھلے
اور
دیارِ ظلم سے آزاد ہوں
رِہا ہو جائیں
جتن ہزار کیے
کر چکے ہر اک تدبیر
بقا کی آخری صورت بھی ہو گئی بے سود

مرے خدا!
یہ تہی دست بے اماں بندے
اُٹھائے ہاتھ
کھڑے ہیں
بس اک اماں کے لیے

ہیں بے خبر
انھیں تقدیر کا پتہ ہی نہیں.....!!!

(۲)

دیارِ بے مکیں

یہ کس دیار کی جانب
قدم رواں ہیں مرے
یہ کس جنوں نے مجھے
رہ گزار بخشی ہے
میں دوڑ دوڑ
ادھر کیوں رواں ہوں
کس کے لیے

قدم بڑھیں جو کسی اور سمت اک لحظہ
کشش کی ڈور
کہ پھر کھینچتی ہے
کہتی ہے
رواں رہوں میں اسی سمت
اسی رہ گزار پر پیہم
چلوں جنوں کی اطاعت میں
بے تکان یوں ہی

اگر چہ
مجھ کو بہت خوب ہے خبر کہ قدم
ہیں جس دیار کی جانب
جنوں کے ساتھ رواں
وہاں مکیں ہے کوئی
اب نہ کوئی جائے پناہ
کھنڈر ہیں اب وہاں آباد
اور ہر جانب
اداس چیختی خاموشیاں ہیں خیمہ زن
تو پھر جنوں مجھے کھینچے ہے کیوں اُسی جانب
تو پھر خرد مجھے زنجیر کیوں نہیں کرتی...!!!

غزل/نظم

کاشف بن قمر مرادآبادی

سارے زخموں پہ بہار آگئی زیبائی کی
اے خدا رُت نہ بدل دیجیو پُروائی کی
وہی شمع وہی ساغر وہی تم ہو وہی میں
آکے دیکھو کبھی محفل میری تنہائی کی
پھول عارض پہ کھلے چاند تھا پیشانی پر
زلف بکھری تو گھٹاؤں نے پذیرائی کی
آتش گل کے شرارے ہیں میری سانسوں میں
موسم گُل نے مرے ساتھ میں صحرائی کی
اپنی تصویر تو رہنے دو میری دنیا میں
کیسے کاٹوں گا مسافت شبِ تنہائی کی
زرد پتّوں کے بھٹکنے سے جو اُٹھتی ہے صدا
غور کیجئے یہی آواز ہے شہنائی کی
رُخ پہ پھولوں کے پسینہ چھلک آیا کاشفؔ
بات جب کی کسی رخسار کی رعنائی کی

علیم صبا نویدی

زبان اردو

کھول رکھی ہیں رسائل نے دکانِ اردو
عیش و عشرت میں ہیں تجارِ زبانِ اردو
کس قدر شان ہے دفنائی ہے شانِ اردو
قبر کی بے کسی دیتی ہے بیانِ اردو
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے ذرا پوچھ تو لیں
خود ہی اپنوں نے مٹایا ہے نشانِ اردو
جب سے ہونے لگی مفلوج موذّن کی لحن
کون سننے کو ہے تیار اذانِ اردو
حاکم وقت بھی کرنے لگا چوروں کو پسند
نکلے قزاق ہیں سب راہبرانِ اردو
شانِ و شوکت سے سدا کہتی ہیں دانش گاہیں
جیب میں اپنی ہے وہ جان جہانِ اردو
خاک آلود ہے جس طرح لحد غالبؔ کی
بس اسی طرح ویران مکانِ اردو
فاتحہ پڑھنے کو اک صف میں کھڑے ہیں نقاد
دفن سب ہو گئے ہیں تاجورانِ اردو
ہے دمِ نزع میں کب جانے نکل جائے گی جان
آخری لے لیں صباؔ اور بیانِ اردو

غزلیں

بابر شریف

ایک ٹھہرے وقت کے اب درمیاں زندہ ہوں میں
لوگ یہ کہنے لگے ہیں پھر کہاں زندہ ہوں میں

ایسا لگتا ہے ابھی تک نیند سے جاگا نہیں
خواب کی ویران راہوں میں جہاں زندہ ہوں میں

وہ کبھی میرا بھی ہوتا ہے کبھی میرا نہیں
دھوپ اور پرچھائیوں کے درمیاں زندہ ہوں میں

زندہ رہنے کا سلیقہ بھی ضروری ہے بہت
نہ کہ یہ کہتے پھرو سب سے میاں! زندہ ہوں میں

مجھ میں تھوڑی جان باقی ہے ابھی بابر شریف
شہر یاروں کو خبر کر دو کہ ہاں زندہ ہوں میں

احمد فلک

صورت دلرُبا ہے آنکھوں میں
پیکر با وفا ہے آنکھوں میں
حسن جلوہ نما ہے آنکھوں میں
عشق بیٹھا ہوا ہے آنکھوں میں
آئینہ دیکھنے کی تاب نہیں
تیرا چہرہ بسا ہے آنکھوں میں
ساری دنیا تلاش کرتی ہے
کون آکر چھپا ہے آنکھوں میں
چشم ساقی سے پی رہا ہوں میں
نشہ دو آتشہ ہے آنکھوں میں
جانے کیا کچھ چھپا لیا اس نے
ہر کوئی دیکھتا ہے آنکھوں میں
ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھو
ایک عالم بسا ہے آنکھوں میں
ٹوٹ جائے نہ باندھ آنسو کا
غم کا دریا رُکا ہے آنکھوں میں
خشک ہو نٹوں کا بولنا کیسا
عشق تو بولتا ہے آنکھوں میں
شام ہجراں ہے اور دل ہے فلکؔ
سایا اک تیرتا ہے آنکھوں میں

شاعری

غزلیں

کشورسلطانہ

آزمائش ہے ، ہر پل نبھاتے ہیں ہم
دل کو اپنے بھی کندن بناتے ہیں ہم

غم نہیں ہم نوا کوئی اپنا نہیں
ایک تم ہی سے محفل سجاتے ہیں ہم

شام ہوتی ہے، ہر صبح آتی بھی ہے
درد کو اپنے دل سے لگاتے ہیں ہم

رُت ہے برسات کی دل دوانہ بھی ہے
کب ہواؤں سے دامن بچاتے ہیں ہم

دوستوں کو قریں اپنے لائے ہوئے
سازشوں میں گھرے خود کو پاتے ہیں ہم

مانا چھوٹا ہے گھر پر ہے خوشیوں بھرا
رنگ و روغن سے اس کو سجاتے ہیں ہم

غور اور فکر میں کھوئے رہتے ہیں پر
کارنامے بھی کشور دکھاتے ہیں ہم

انسانیت کا درد ہو گر آدمی کے ساتھ
ماہ و نجوم چومیں قدم ہر خوشی کے ساتھ
فرصت ملے تو دیکھ ذرا حسن کا ئنات
کون و مکاں سجے ہیں یہاں دلکشی کے ساتھ
شام و سحر کے ساتھ ہی رعنائیاں بھی ہیں
ہوش و حواس گر ہیں، مری بے خودی کے ساتھ
قلب و نظر میں کوئی تجسس نہ آرزو
جیتے ہیں لوگ کیسے یہاں بے حسی کے ساتھ
مہرو وفا کی ریشمی یہ ڈور ہے عجیب
ہوتی نہیں ہے شرط کوئی دوستی کے ساتھ
ویسے تو مہرباں بڑی لگتی ہے زندگی
لاتی ہے رنج و غم بھی ہمیشہ ہنسی کے ساتھ
کمزور نا تواں سہی، مانا ہے آدمی
جینے کا حوصلہ بھی تو ہے زندگی کے ساتھ
باطل بھی، حق بھی دونوں ہی کشور کے ساتھ
باقی ہے تیرگی بھی ذرا، روشنی کے ساتھ

نعیم کوثر

روح کا سرگم

میں نے پکّا ارادہ کیا تھا۔ببّن خاں گونگے پکھاوجی کی اسٹوری ضرور کروں گا۔استاد رجب علی خاں پر میرے ٹی وی چینل نے خوب واہ واہ لوٹی۔ پتاجی کو سنگیت اور شاعری سننے کا بہت شوق تھا۔کوی سمیلن، ہو، یا مشاعرہ، موسیقی کے چھوٹے بڑے پروگرام، وہ پابندی سے وہاں موجود رہتے۔امیر خسرو کے بڑے قدر داں بچپن میں ہمیں پہلیاں سناتے اور بجھواتے۔ مجھے یاد ہے۔محلّہ میں رحیم بخش دھنیا تھا۔سال بھر روئی دھنتا۔ بیوی اور دو لڑکیاں لحاف گدّوں میں ٹانکے لگاتیں۔سردی کا موسم دستک دیتا۔اس کی تانت کی رفتار اور کام بڑھ جاتا۔سورج نکلتا تو چلتی اور صبح اذان پر خاموش ہوتی۔امیر خسرؔو نے دھنیے کی نقل موسیقی میں ڈھالی تھی۔رحیم بخش کے گھر سے آواز گونجتی۔ ہم سب بچے پتاجی سے ضد کرتے نقل سنائیں۔جب بڑا ہوا تانت چلتی تو میری نقل اس کی سنگت کرتی۔

درے جانان ہم رفت جان ہم رفت
جان ہم رفت رفت رفت جان ہم رفت
اینہم رفت وآنہم رفت آنہم رفت آنہم رفت
اینہم آنہم، اینہم آنہم، آنہم رفت

رحیم بخش بوڑھا ہو گیا۔ بیٹے نے مشین لگا لی۔ منٹوں میں ڈھیروں روئی دھن کر رکھ دیتی ہے۔تانت آج بھی کونے میں ٹکی رکھی ہے۔''درے جانان ہم رفت'' چھومنتر ہو گیا۔

پتاجی سنگیت پریمی تھے۔گراموفون کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ کباڑی کو ردّی کے ساتھ دے دیا۔ ان کے پسندیدہ ریکارڈس بطور یادگار رکھ چھوڑے ہیں۔وہ مذہبی آدمی تھے۔آخری سانس تک دھرم کرم گھر میں رہا۔جنم اشٹمی میں آستھا زیادہ تھی۔ پنّا لال گھوش کی بانسری کا ریکارڈ دیر رات تک سنتے۔ بانکے بہاری بانسری پر زندگی کا گیت چھیڑتے۔گوپیاں دھن پر گاتیں۔رقص کرتیں۔ ماتاجی ان کے سنگیت پریم سے الجھتیں تو شری کرشن بھگوان کے بول سنا دیتے۔

''ائے نارد، نہ تو میں بیکنٹھ میں رہتا ہوں نا ہی یوگیوں کے دل میں۔

مگر میرے بھگت جہاں گانا گا کر مجھے یاد کرتے ہیں وہیں میں موجود رہتا ہوں''۔

میں نے تان سین، سوامی ہری داس، نائک بیجوا ور نائک گوپال کے بارے میں پڑھا ہے ۔ بادشاہوں راجے مہاراجاؤں اور نوابوں کی فیاض سرپرستی تھی۔ دیوی دیوتاؤں کے ہزاروں سال کے سنگیت کو زندہ رکھا۔ راجہ مان سنگھ خود سنگیت کار تھے۔اپنی رائے مرگ نینی کے نام سے گان ودیالیہ گوالیار میں قایم کیا۔میاں تان سین نے یہاں پانچ سال تعلیم حاصل کی۔ببن خاں گونگے پکھاودی کا بڑا نام تھا۔ان کے والد لڈّن خاں دھرپد کے نامی گرامی گایک تھے۔دھرپد کے گیتوں کا خزانہ تھا ان کے پاس۔ الاپ اور گمک سے سننے والے سدھ بدھ کھو بیٹھتے۔سُر گہرے اور مدھر۔مہاراجہ گوالیار کے دربار میں سمراٹ مانے گئے۔ جئے پور، ہولکر اور رامپور بلائے جاتے۔عزت اور خلعت لاتے۔

میں دو دن کے لیے گوالیار آیا۔ببن خاں کے پوتے نتھن خاں کا پتہ لگایا۔ وہ گلی بس اتنی چوڑی تھی کہ تانگا چلا جائے۔ دائیں بائیں نالیوں میں گندگی۔ مکھی، مچھر، اور بدبو، آس پاس کچے مکان، نتھن خاں ململ کا کرتا پہنے تھا۔ چوڑی دار پاجامہ پاؤں میں چپّل، آنکھوں میں خوشی کی چمک دمک۔میرے آگے آگے چلتا گیا۔ٹی وی پر انٹرویو اور فوٹو آئے گا۔ باپ دادا پر بات ہوگی۔سارا

دیش دیکھے گا۔اس کی دیوانگی اور جوش دیکھنے کے قابل۔ جیسے مجھے تاج محل دکھانے لایا ہو۔

''بس بھائی صاحب، اگلا دروازہ غریب خانے کا''

میں اپنے پیشہ کو عبادت سمجھتا ہوں۔کام کی دھن سوار ہو جائے۔تن من دھن سے پورا کرتا ہوں۔ ذرا سی سلوٹ جھول رہ جائے۔ بھوک اڑ جاتی ہے۔کتابوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ۔اچھا خاصہ روشن دان۔نتھن دانت نکالے رک گیا۔ بڑے بالوں والی دو بکریاں نظر آئیں۔مرغا مرغیوں کے کڑکڑانے کی آواز سنائی دی۔میلی کچیلی شلوار کرتے میں عورت نما شکل، ادھ ننگی بچی صاف دکھائی دی۔ یہ تھا پکھاوداور دھرپد سمراٹ کا آثار قدیمہ میں لرز گیا۔

''اندر ہولو۔مہمان آ گئے۔نتھن خاں نے آواز لگائی۔ چند پل بعد پردہ اٹھایا۔ مجھے اندر بلایا۔چھوٹی سی انگنیا پار کر ایک کمرے میں لے گیا۔سامنے دیوار پر آئیل پینٹنگ آویزاں تھی۔ اشارہ کر کے بتایا۔

''یہ ہیں میرے دادا۔بن خاں گونگے پکھاوج''

چار فٹ اونچی، ڈھائی فٹ چوڑی رہی ہوگی۔ سیاہ، سبز اور سرخ رنگ، بلند قامت، چھوٹے کان، جوڑی پیشانی، ستواں ناک، گول چہرا، غلافی آنکھیں، کاجل کھنچا ہوا، کڑکدار لمبی مونچھیں، ڈھیلی آستینوں کا انگرکھا۔سر پر گوالیاری گول ٹوپی۔چوڑی دار پائجامہ، پاوں میں جئے پوری جوتے، پیروں کے پاس پکھاوج ،کرسی پر تنے بیٹھے تھے گوالیار دربار کے نامور پکھاوج نواز بن خاں گونگے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں توطی بولتا تھا۔چھوٹی سی حویلی ،نوکر چاکر بگی اور گھوڑے۔میرا دل بیٹھ گیا۔مہاراجاؤں کی فیاضی کی راکھ، بکرا بکری اور پشیمان مگر سورمائی غربت، جینے کا چھوٹا موٹا انتظام،سنگیت کی دیواریں ڈھ گئیں۔لڈّن خاں کی دھرپد، بن خاں کی پکھاوج، چار فٹ کی پینٹنگ یوں کہہ لوں موسیقی کی یادگار برقرار تھی۔گندی نالیوں والی گلی میں۔

میں ٹین کی پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔طاق میں دو چار کتابیں رکھی تھیں۔نتھن خاں نے ایک پرانی کتاب اٹھائی۔کرتے سے دھول جھٹکی۔ مجھے دے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ہندی میں چھپی تھی۔ٹائٹل پر مہاراجہ جیا جی راو کی تصویر، کشتی نما پگڑی، ہیرے جواہرات ہوں گے پوشاک پر، کمر میں تلوار،کافی پرانی کتاب میں نے بن خاں پکھاوجی کے کئی زاویے سے فوٹو کھینچے۔نتھن خاں کی بھی تصویر لی۔وہ بولا۔

''ایک بیٹی ہے اس کا بھی فوٹو لے لیں۔'' میں نے ہاں کہا۔اس نے پکارا''ارے جمالہ کو کپڑے پہنا کر بھیج دو'' یہ مرحلہ بھی پورا ہوا۔ ذہن میں چنگاریاں تصور میں شاندار ماضی پر اڑتی خاک۔

''نتھن تمہارے خاندان کے پاس حویلی تھی وہ کہاں گئی؟''

''جی ہاں!غوث پورہ میں مہاراجہ صاحب نے دی تھی۔''اس کتاب میں سب کچھ ہے۔اس کی آنکھیں نم تھیں۔وہاں حضرت شاہ غوث کا،تان سین کا مزار ہے۔وہ آج بھی ہیں۔لڈّن خاں صاحب کی چھوٹی حویلی بارہ کمرے۔بن خاں صاحب کی موت ہوئی۔ بھائیوں میں بٹ گئی۔سندھیا سرکار گئی۔لال قلعہ ہمارا ہوا۔سنگیت کے سرتال کمزور پڑ گئے۔موسموں کی طرح نصیب بھی بدلتا ہے۔دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رہ گیں۔ان کا سنگیت اناتھ ہو گیا۔نئی سرکار کو کروڑوں کا دیش چلانا تھا۔سرالاپ کی فکر کس کو۔ شیوراتری کو راج محل میں بڑا سماروہ ہوتا۔راج دربار کا ہاتھی سج دھج کے آتا بن خاں صاحب ہودہ میں بیٹھتے۔ ودمیں پکھاوج، بڑی شان سے جاتے۔ رات بھر دھرپد، پکھاوج کے جادوئی سر اور

تھاپ، آج اس راگ کو خیال اور ٹھمری نے اپاہج کر دیا۔ پکھاوج اس کی سنگنی کس گنتی میں۔ نتھن تھک نہیں رہا تھا۔ میں سکون سے سنتا گیا۔

''اس کتاب میں سب کچھ ہے''

میں نے پکھاوج کی طرف اشارہ کیا۔''اسے کیوں سنبھال کر رکھا ہے''۔

''یہ بن خاں صاحب کے فن اور قبر کا کتبہ ہے۔''اس کا بھی زمانہ رہا۔ اس میں راگ کی آواز کے اتار چڑھاو کی خوب صورتی کا اپنا رنگ تھا۔ ہر طرف دھوم، گونگے دادا کی ہتھیلی کا کمال۔ منہ سے نہ باپ کو پکارانہ ماں اور اولاد کو۔ اس سے یوں کھیلتے مانو ممتا بچے کو جھلاتی ہو۔ ان کی آواز ہتھیلی اور انگلیوں سے گونجتی۔ ابّا کہتے تھے، زندگی بھر کی داستان ہے یہ پکھاوج، جو گونگی نہیں بولتی تھی، بول سکتی ہے۔ سننے والے کہاں۔

''اس کتاب میں سب کچھ ہے'' ابّا نے کچھ دن مشق کی۔ مایوس ہو گئے۔ وہ کلیجے سے لگائے رہے۔ دادا صاحب کے ساتھ محل میں آتے جاتے۔ میں نے ایک بول سیکھا۔'' تگ دھم تگ تگ، جمعہ کے دن شہر سے دور جاتا ہوں۔ چرواہے مویشی چراتے ہیں۔ کچھ دیر ہتھیلی سے تھاپ دیتا ہوں۔ دونوں طرف تانت، چھلی کس دیتا ہوں۔ یہ ضروری ہے۔ پکھاوج کا کٹّر پن اور گمبھیرتا بنی رہے۔ اس نے سمان دیا۔ تبھی آپ غریب خانے پر آئے۔ ایک بات اور بتاؤں۔ ساون کی جھما جھم بارش ہو رہی تھی۔ لڈن خاں صاحب محل سے نکلنے کو تھے۔ تبھی ان کا بھائی گھوڑا دوڑاتا آیا۔ گھوڑے سے اُترا اور خوشی سے چیخا۔''بھائی جان مبارک، بھابی کے بیٹا ہوا ہے۔''لڈّن خاں صاحب جھوم اٹھے۔ وہیں سجدہ کیا۔ خدا کا شکر بجالائے۔ شادی کے دس سال ہوا۔ بیٹا اب ہوا۔ حضرت غوث کی دعا قبول ہوئی۔ بہت خدا رسیدہ، کرامتی، درویش تھے۔ میاں تان سین بچپن میں ان کی تربیت میں رہے۔ متھرا کے سوامی ہری داس ان کے پاس آتے تھے۔ حضرت غوث نے اپنے منہ کا چھوٹا پان میاں تان سین کے منہ میں ڈالا تھا۔ لڈن خاں صاحب بیٹے کو مخمل کی چادر میں لپیٹ حضرت کے مزار پر لے گئے۔ سیڑھیوں پر رکھ دیا۔ دعا مانگی۔ سنگیت کا بلند درجہ ملے۔ اب سوچتا ہوں بن خاں صاحب کے منہ میں سیڑھیوں کی خاک ڈال دیتے لڈن صاحب آواز اور نغمہ مل جاتا۔

''اس کتاب میں سب کچھ ہے'' چائے پئیں گے۔

''نہیں نتھن۔'' میں نے کتاب لی۔ ہوٹل میں پڑھنے اور کل لوٹانے کا وعدہ کیا۔ وزیٹنگ کارڈ دیا۔ ہوٹل کا پتہ بتایا۔ نتھن خاں نے گھگھیا کر فرمائش کی۔''بھائی صاحب ان بکریوں کا فوٹو لے لو' تاریخی بکریاں ہیں۔ ایرانی نسل نواب رامپور نے ایران سے منگوائیں تھیں۔ محل میں پال رکھا تھا۔ خاص خاص مصاحبوں کو دیتے تھے۔ لڈن خاں صاحب کو ایک جوڑا دیا۔ وہ دھرپدگا نے رامپور گئے تھے۔ خاندانی یادگار ہیں۔ سال میں دو بار جنتی ہیں۔ عید منا لیتے ہیں۔ ان بے زبانوں کو بھی کھلانا پڑتا ہے۔ صبح شام دو لیٹر دودھ دیتی ہیں۔ پونے دودھ لیٹر فروغ کر دیا۔ تیس روپے مل گئے۔ مرغیوں کے پانچ انڈے۔ دیسی مرغی کا چھ روپے میں جاتا ہے۔ تیس روپے آ گئے۔ اوسط میں چالیس روپے روز ہم نے کچھ نہیں سیکھا۔ چالیس روپے میں بھوک پیاس سے سمجھوتا کر لیا۔

''آپ تو پڑھے لکھے ہیں بھائی صاحب، خاندان کے خاندان مٹ گئے۔

نامی گرامی سنگیت کار بھی گئے، سنگیت زندہ ہے''

''اچھا چلتے ہیں۔ کل آوں گا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پوچھنے لگا۔''ٹی وی پر کب آئے گا۔ مجھے کیسے پتہ چلے گا۔ پڑوس میں جا کر دیکھ لیں گے۔ محلّہ کے گھر گھر میں خبر کریں گے۔ میں نے

اطمینان دلایا۔''تمہیں اطلاع دوں گا''۔ وہ گلی کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ مین روڈ پر ٹیکسی مل گئی۔ پروگرام تھا رات میں نوٹ بناوں گا۔ صبح غوث پورہ شام کو ممبئی کا ریزرویشن ہے۔ رات 4 بجے کا م پورا ہوا۔ بیڈ پر لیٹا رہا۔ گھنٹے بھر بعد نیند آئی۔ صبح 9 بجے اٹھا۔ نہایا۔ ناشتہ منگوایا۔ کپڑے بدلے۔ لفٹ سے نیچے آیا۔ ٹیکسی بک تھی۔ گوالیار شیطان کی آنکھ ہو گیا۔ آس پاس کے گاوں ہضم کر گیا ایک گھنٹے میں غوث پورہ آیا۔ بڑی آبادی۔ ڈرائیور نے پوچھا''کہاں روکوں''میں نے بتایا''غوث صاحب میاں تان سین کے مزار لے چلو''۔

بڑا مقبرہ تھا۔ پرانا طرز تعمیر برقرار۔ رنگ روغن ہوتا ہوگا۔ مجاور سے بات ہوئی۔ حضرت غوث کی کرامات بتائیں۔ بڑے ولی تھے۔ تان سین کے بھولے بسرے قصے سنائے۔ دیپک راگ اور ملہار کی باتیں بھی۔ 20 میٹر دور میاں تان سین کا مزار بہت عالی شان سرکار کی نگرانی میں مجاور اور تنھن کی باتوں میں یکسانیت۔ املی کا پیڑ دیکھا۔ پرانا سوکھ گیا۔ شوقین گویئے پتیاں تو رتوڑ کھا گئے۔ کہتے ہیں میاں تان سین سی آواز نصیب ہو جائے گی۔ دوسرا پیڑ لگایا۔ پھل پھول رہا ہے۔ بہت گھنا ہے۔ اب پتی کھانے والے نہیں آتے۔ کلاسیکل سنگیت کار کوئی بننا نہیں چاہتا۔ پلے بیک سنگر کے خواہشمند اکّہ دکّہ آجاتے ہیں۔ عرس ہوتا ہے مشہور سنگیت کار آتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا دھرپد گایک اور پکھاوجی نہیں آتے۔ قریب ہی جیاجی کاٹن مل اور مزدوروں کے کوارٹر۔

کئی فوٹو بنا کر ہوٹل پہنچا۔ لابی میں صوفے پر تنھن خاں میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے لیکر کمرے میں آیا۔ وہ بھونچکہ حیران تھا۔ میں سمجھ گیا۔ ٹوٹی چارپائی، افلاس کا نمونہ بھول چند لمحے کو ایئر کنڈیشن کمرہ، صوفہ سیٹ، سفید براق چادریں اور تکیے۔ دماغ میں سناّٹا تو چھائے گا۔ خوب صورت ٹی سیٹ میں چائے اور بٹر سلائس، چھوا ور چکھا۔ انگلیاں اور دانت شرما گئے ہوں گے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ کتاب واپس کی۔ ہزار روپے دیئے۔ ٹی وی چینل کی طرف سے آگے اور ملیں گے۔ میں نے سمجھایا۔ وہ اٹھا پھر بٹھا جیسے اس جنت سے جانا نہ چاہتا ہوں۔ میں نیچے تک چھوڑنے گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ مانو قارون کے خزانے کی کنجی مل گئی۔

بھسا دل کا اسٹیشن آیا۔ ہوش اڑ گئے۔ دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ احساس ہوا، دماغ پھٹ جائے گا۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ چمڑے کا بیگ غائب تھا۔ سرہانے ٹانگ رکھا تھا۔ کیمرہ، ڈائری، دیگر ضروری کاغذات، لڑکھڑاتا کنڈکٹر کے پاس گیا۔ جرنلزم کی ٹمٹماتی توانائی یکجا کی۔ لٹ جانے، برباد ہونے کا دکھڑا رویا۔ کنڈکٹر نے وائی ٹاکی پر گارڈ کو بتایا۔ بڑے ٹی وی چینل کا معاملہ، جی آر پی میں رپورٹ کرنی ہے۔ ٹرین آگے نہ بڑھائیں۔ رپورٹ ہو گئی۔ کاروائی کا وعدہ کیا گیا۔ میں نے کمپارٹمنٹ سے سوٹ کیس اُتار لیا۔ گوالیار واپس جانا ہے۔ طے کر لیا۔ ہر قیمت پر مشن پورا کروں گا۔ تنھن خاں کی نالیوں کی گندگی، بکریاں، مرغیاں، جمالہ، آئل پینٹنگ، کتاب جس میں سب کچھ ہے، دھیان میں تھیں۔ آئی فون شرٹ کی جیب میں تھا۔ ہمیشہ سفر میں ایسے ہی رکھتا ہوں۔ کب پتنی کا فون آجائے۔ اس میں تصاویر لے لوں گا۔ تنھن خاں کا ٹی وی دیکھنے کا سپنا پورا کروں گا۔ دھرپد اور پکھاوج کی ٹریجک داستان دکھاوں گا۔

گوالیار کے لیے دو گھنٹے بعد ٹرین تھی۔ ابھی ہوش حواس ٹھکانے نہیں آئے۔ چمڑے کا بیگ میری شہ رگ۔ سوچتا اور کڑھتا۔ کیمرہ کمپنی کا، الف آئی آر کی کاپی ہے۔ دوسرا مل جائے گا۔ لیکن بن خاں گونگے، تنھن خاں کی اطلاعات اور کتاب۔ اسٹوری کی روپ ریکھا وہیں ہے۔ دیر رات گوالیار پہنچا۔ ہوٹل کے کمرے میں کئی گھنٹے بت بنا بیٹھا رہا۔ گزشتہ رات کی کڑیاں

جوڑنے کی کوشش کی۔ بہت سی باتیں یاد آتی گئیں۔لیکن کتاب کے حوالے اہم ہوتے ہیں۔نتھن خاں سے اسے حاصل کرنا ہے۔تمام تصاویر دوبارہ آئی فون میں اتارنا ہے۔یہ سب اسٹوری کی آتما نتھن خاں کی دیوانگی تڑپتی تمنا۔ ٹی وی پر خاندان خود جمالہ اور ایرنی بکریاں، شہر بھر میں ماضی زندہ ہوگا۔ وہی مکھی، مچھر، بدبودار گلی، وہی پکھاوجی کا ٹاٹ کا پردہ۔

''نتھن خاں صاحب''۔ میں نے آواز دی۔

اندر سے پوچھا''کون'' جواب دیا کل والا ٹی وی بھائی صاحب''۔

آج جمعہ ہے وہ سویرے ہی نکل گئے۔

''کب آئیں گے''میں نے پوچھا۔

''شام کو سورج ڈھلتے ہی''۔کہاں جاتے ہیں؟ اندر سے جواب ملا۔

''گوالیار قلعہ پر شمالی طرف نیچے بیٹھتے ہیں۔''مین روڈ پر ٹیکسی میں بیٹھا۔گوالیار فورٹ تاریخی جگہ ہے۔ وہاں پہنچا۔شمالی ترائی کی طرف نظریں گاڑیں۔ دوڑی پگڈنڈی نیچے بکریاں اور گائیں دکھائی دیں۔یقین ہوگیا نتھن وہیں کہیں ہوگا۔تیز قدموں سے چل دیا۔آدھا کلومیٹر دور گیا۔ پکھاوج پر تھاپ سنی، رکا آنکھیں پھاڑیں۔کان آواز کی طرف لگائے۔ بائیں طرف ایک چٹان پر نتھن خاں بیٹھا تھا۔ سامنے پکھاوج، قریب گیا آواز دی۔ وہ چونک گیا۔ پکھاوج اٹھائے اتر کر آیا۔''بھائی صاحب'' یہاں کیسے؟ میرا پتہ کس نے بتایا؟

میں نے بھساول کا حادثہ سنایا۔دل پر لگی چوٹ کا رونا رویا۔ اپنے مشن کو پرتگیہ بتایا۔ وہ کتاب، آئیل پینٹنگ، جمالہ، تمہارا اور بکریوں کا فوٹو کھینچنا ہے۔سو تمہارے غریب خانے گیا۔ اندر سے پتہ پوچھ کر آیا ہوں۔اسٹوری ہر قیمت پر بناؤں گا۔نتھن خاں اچانک بلک کر رونے لگا۔میں گھبرا گیا۔

''ارے ارے یہ کیا؟ بچوں کی طرح روتے ہوں۔ مجھے بتاؤ ایسا کیا ہوگیا؟'' کرتے کے دامن سے نتھن خاں نے آنسو پونچھے۔ہم دونوں گھانس پر بیٹھ گئے۔

''بھائی صاحب کئی سال سے فورٹ آتا ہوں۔ گھنٹے بھر دادا صاحب کی پکھاوج کو بیدار کرتا ہوں۔ وہ بھی ان کے والد، میں اور یہ پکھاوج یہیں، یہاں گوالیار میں پیدا ہوئی۔نتھن خاں کا گلا بھر آیا۔''آج عجیب واقعہ ہوا۔ یہ سامنے بکریاں سب ایرانی نسل کی ہیں۔لڈن خاں صاحب والی۔ میں پکھاوج پر''تگ دھم تگ تگ''بول نکال رہا تھا۔ کچھ بکریاں سامنے آکر بیٹھ گئیں۔کافی دیر تک سنتی رہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی قدرداں ملا۔میٹھی آواز میں پوچھا۔ پسند آیا۔دادا کی ہتھیلی کا کمال۔تب زوردار ہوا چلی۔معلوم ہوا آندھی آنے والی ہے۔زور سے آواز بھری۔گمان ہوا بکریاں بول رہی ہیں انسانوں کی طرح۔''ہم کیا جانے راگ راگنی۔تم جو بجاتے ہو وہ ہماری دادیوں کی دادیوں کی دادی کی کھال ہے۔ہتھیلی رگڑتے ہو، ہمیں لگتا ہے دادی بلاتی ہے۔''

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ ہواؤں کے جھکڑ نے مجھے رحیم بخش کی تانت گونجتی سنائی دی۔

''در پے جانا ہم رفت۔جان ہم رفت۔رفت رفت۔ جان ہم رفت''۔

سب رس

میں صرف غیر مطبوعہ مضامین اور

تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

احمد رشید

افسانہ

حصار

اب فردوس میرے سامنے ہے لیکن اس سے پہلے ایک طویل عرصہ تک آتشِ فرقت سے میری آنکھیں پگھلتے ہوئے غم میں نم ہوتی رہی تھیں۔ وہ جو کبھی مرکزِ نگاہ تھی، میری منزل تھی اب خوابِ منزل ہے، خواب جو حقیقت کے پسِ پشت ہوتا ہے۔ حُور کا وجود اور اس کا خوبصورت ہونا اس لیے حقیقت ہے کہ وہ میری مسہری پر سوئی ہے اور مجھے بیدار کر رہی ہے لیکن میری بیداری کے عالم میں بھی وہ ہمیشہ دسترسِ نگاہ سے دور رہی ہے شاید اس لیے کہ ہمارے راستے الگ منزلیں لاپتہ' تہذیبی حدود ایک ، سیاسی سرحدیں جدا۔ میرے ساجن اس پار، میں اس پار۔ او میرے مانجھی لیکر چل ندیا پار۔۔ وہ ندی کی طرح سیدھی سادی، بہتے پانی کی طرح نرمل اور شیتل، لہروں کی مانند نازک اندام، زیرِ آب ڈوبی ہوئی آفتاب کی پہلی کرن، میرے اندر چبھن سی ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے عجلت میں لکیر بنائی پہلے دلوں کے بیچ ریکھا کھینچی ہوتی۔ اِس وقت یہاں وہاں سائیں سائیں کا شور ہے اور چاروں طرف سنّاٹا ہے۔ بیڈروم کی خاموش دیواریں بول رہی ہیں باہر سے ہواؤں کی چاپ اور سردی اندر داخل ہو رہی ہے۔ میں نے سگریٹ سلگایا فضا میں دھوئیں کی لکیریں دنیا کے نقشہ کا جال بننے لگیں زندگی کے دھندلے رنگ گہرے ہونے لگے۔ کل اور آج کا فرق مٹ گیا ہے جیسے گزرے وقت اور موجودہ لمحات کے درمیان کی دیوار ٹوٹ گئی ہو۔ تقریباً تیس سال پہلے کا پھونس بنگلہ جو اب سمنٹ کا بن گیا ہے لیکن اب بھی پھونس بنگلہ ہے جیسے تہذیب کی جڑیں روایت میں اور جدت کا رشتہ قدامت میں پیوست پھر نیا کیا اور پرانا کیا؟ شناخت تو وہی ہے جو اس کی بنیاد ہے۔

پھونس بنگلے میں پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس مس تھومس ایک خوش مزاج، بے تکلف اپنی تہذیب کی پروردہ خاتون تھیں۔ میں انٹرول میں ان کے ساتھ چائے کی پیالیوں میں تھکن اور بچوں کی چیخ پکار انڈیلتا لیکن فردوس کا چائے میں شریک نہ ہونے کا رویہ باعث تشویش تھا شاید اس رویہ کا میرے اوپر گہرا نقش اس لیے ہوا کہ مغربی اثرات کی ہوا اسے نہیں لگی تھی حالانکہ پچھا دیہ ہواؤں کی زد میں پورا ایشیا اایسا کراہ رہا ہے کہ مغربی اور مشرقی فاصلہ قرب و بعد میں تبدیل ہو کر یہ پہچان بھی ختم ہوگئی ہے کہ مغرب کیا اور مشرق کیا ہے؟

فردوس آسمانی رنگ کی بیڈ شیٹ پر آسمانی مخلوق کی طرح مجھے جگا رہی ہے عمر کے اس ڈھلان پر بھی کھنڈرات، عمارت عظیم ہونے کی دعوے داری آج بھی کر رہی ہے اور کل بھی کرتی تھی۔

''تم ندی جیسی معصوم ہو''

''ندی کی معصومیت-طہارت میں چھپی ہے''

''کبھی کبھی اس میں کٹاؤ بھی آتا ہے''

''جب ساحل کمزور ہوتا ہے''

کھڑکی پر ٹنگے پردوں کی سرسراہٹ سے چونک گیا ادھر ادھر نگاہیں گھمائیں..... ہاں سچ کہا تھا ساحل جب کمزور ہوتا ہے تب ہی ہلکے سے طوفان کی آہٹ سے پانی ادھر ادھر نکاسی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور ندی بے قابو بھی ہو جاتی ہے۔ میں اس وقت یہی سوچتا تھا کہ اگر وہ ندی ہے تو ساحل کے مضبوط ہونے کا اشارہ میری طرف ہے اگر وہ خود ہی ساحل ہے تو میں یہ کیوں بھول جاؤں کہ عورت ہوتی ایسی ہی ہے؟ پھر وہ تو فردوس ہے جو رات اور

دن فردوس کا خواب دیکھتی ہے۔ وہ اس وقت بھی گہری نیند میں محو خواب ہے دائیں ہاتھ رخسار کے نیچے دائیں کروٹ دونوں پاؤں میں ہلکا سا خم، کمر کا جھکاؤ دوج کا چاند جیسے ہالے میں بدن کے نشیب وفراز سمیٹے ہوئے میرے سامنے روحانی خوشی کا سبب ہے۔

میرے دیکھنے کا اشتیاق روز افزوں بہانے تلاش کرتا تھا لیکن فردوس کا پردہ سے باہر ہونا مذہبی روایت کے ٹوٹنے کا اندیشہ ستاتا تھا۔ مگر دل ہے کہ ہر دیوار کو توڑنے کے لیے کوشاں تھا۔ ایک روز اچانک کھڑکی کے پٹ کھلے تھے سرد ہواؤں کے جھونکے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی طلباء میں مصروف، اپنے حسن سے بے پرواہ تھی۔ شاید اس کو یہ گمان ہو کہ تنہائی کی آنکھ نہیں ہوتی اور تیرِ نگاہ کے نشانہ سے بھی دور، اس کا یقین تھا۔ چاند چہرے پر گیسو چلمن کی طرح بکھر گئے تھے ان کو ہٹانے کا خیال جیسے ہی ذہن میں آیا دبی سگریٹ کے شعلے سے میری انگلی جل گئی تھی اور اس وقت ایک ٹیس سی میرے سینے میں اتر گئی تھی ۔آج اس سے مل کر دل کی بیتابیاں اور بڑھ گئی ہیں۔ اچانک بن اطلاع ملاقات ہونے سے میری زبان گنگ اور منھ کھلا رہ گیا۔

''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں.....

''جب تم گئی تھیں تب بھی تم نے حیران کر دیا تھا''

''زندگی ''حیرانی'' کا نام ہی ہے۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے اچانک ہوتا ہے''

گئی کیوں تھیں''

''والدین کی مرضی سے''

''آئی کیوں ہو؟''

اپنی مرضی سے''

''ڈر نہیں لگتا''

''اب یہ عمر ڈرنے کی نہیں ہے، دوسرے شادی کے بعد عاشق سے ملنے میں عورت کو کوئی خوف بھی نہیں ہوتا''

'' مطلب شادی عورت کے لیے آمد و رفت کا پاسپورٹ ہوتا ہے''

وہ مسکرائی.... میں اس کی مسکراہٹ میں کھو گیا سوچنے لگا۔ فردوس اعلیٰ حسب ونسب کی آسمانی مخلوق نیچ ذات زمینی مخلوق کے بستر پر دراز دنیا سے بے خبر سوئی ہوئی ہے لیکن اس آخری رات کو جب وہ ملاقات کرنے آئی تو دنیا سوئی ہوئی تھی

''نیچ ذات سے مجھے عشق کرنے کا حق نہیں'' اس نے کہا تھا

'' تو کیا اپنی مرضی سے انسان اعلیٰ ذات میں پیدا ہوتے ہیں''

''تمہیں تو ہماری طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرنی چاہئے''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ نائی چھوٹی ذات کے ہوتے ہیں، ایسا ابّا کہتے ہیں''

''تم کیا کہتی ہو''

''دھرتی اور گگن کا ملن آنے والے بھونچال کی سوچنا ہے'' اس نے کہا

''ایک دھوکا ہے.... ہر طرف'' اچانک میرے منھ سے نکلا

چاروں طرف خاموشی طاری ہوگئی آسمان چپ تھا اور زمین گونگی ہوگئی تھی۔ اس وقت تلملانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا جی چاہتا تھا کہ ان صحیفوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں جن میں انسانوں کی اس قدر بے حرمتی اور تذلیل کی گئی ہو۔ سوچتا تھا جب تک راز رہے سلسلہ عشق جاری رہتا ہے۔ افشاں ہونے پر بدنامی اور ناکامی کا

سبب بنتا ہے۔ میری محبت بھی آزار جاں بن گئی۔ فردوس نے اطلاع دی تھی تم سے دور کرنے کے لیے میری شادی پاکستان میں پھوپھیرے بھائی سید ثروت سے کر دی گئی ابّا کا خیال ہے عشق وہ آگ ہے جس میں قریبی پہلے جھلس جاتے ہیں خاکستر میں دبی چنگاری بھی بنا پھونکے شعلہ بن جاتی ہے

اس نے کہا ''ایک تو غم جلاوطنی کا.....

''دوسرا''

''بڑا غم اپنا وطن مان کر بھی بے وطنی کا احساس رہتا ہے''اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں

''وہ تو اپنوں کا وطن ہے''

''لیکن مہاجروں کا نہیں ... اپنوں ہی کے ہاتھوں مرتے ہیں''اس نے کہا

''یہاں اپنا وطن ہوتے ہوئے جلا وطنی کی زندگی گزارتے ہیں''

''وہ کیسے؟''

''فرق اتنا ہے کہ غیروں کے ہاتھوں مرتے ہیں''

''خیر سے شہید تو کہلاتے ہیں''طنزیہ مسکرائی

''عجیب تذبذب کا عالم ہے کہ آدمی فردوس چاہتا ہے اور مرنا بھی نہیں چاہتا''

اس نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی جس کے کوئی معنی نہیں تھے

''تمہارا شوہر کیا کرتا ہے''

''مکانات بناتے ہیں کنسٹرکشن کا کاروبار ہے''

''ڈی کنسٹرکشن بھی کرتے ہوں گے''میں نے اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں جھانکا''ڈی کنسٹرکشن کی کوکھ میں کنسٹرکشن ہوتا ہے، جسے وہ تلاش کرتے ہیں''اس نے پہلو بدلا

مجھے اس کی یہ حمایت بری لگی۔فردوس کا کسی سے اس قسم کا تعلق نہیں تھا لیکن تعلق تو میرا بھی نہیں تھا کسی اور سے۔ پھر بھی عاشقی میں رقابت اور محبت کا جذبہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ انتہائے شوق کا کمال یہ بھی ہے کہ اس کے بطن میں ''حسد'' کا پودہ بنا تخم ریزی کے اگ آتا ہے۔لیکن اس وقت دل کی زمین اتنی زرخیز نہیں تھی کہ کوئی کڑوا بیج بغیر دیکھ ریکھ کے اگ آئے۔ پہلی نظر کا کمال یہ تھا کہ کھڑکی کے قریب بیٹھی فردوس میرے دل و دماغ پر ایسی چھا گئی تھی کہ جب میں نے اس دھندلے عکس کو رنگوں کی زبان دی تو کینوس پر ایسی تصویر ابھر آئی جو حقیقت سے زیادہ خوبصورت تھی آرٹ کے معنی یہی ہیں کہ فنٹاسی حقیقت کا روپ لے لے اور حقیقت فنٹاسی کی صورت اختیار کر لے اس وقت کچھ ایسا ہی ہوا کہ جیسے سخت گرمی کے بعد ریگستان میں جب پہلی بارش ہوتی ہے تو مٹی کی سگندھ فضا میں اس طرح پھیل جاتی ہے کہ پتھر دل بھی ہرن کی طرح مست ہو جاتا ہے۔ وہ اس لمحہ خلا میں اس طرح قدم رکھ رہی تھی جیسے ہواؤں پر پرندے رقص کر رہے ہوں۔ اس موجود لمحے کائنات اس قدر پر اسرار ہو گئی ہے کہ جو دکھائی دیتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا۔فردوس میرے سامنے سو رہی ہے اور میں جاگ رہا ہوں ۔سونے سے پہلے اس نے کہا تھا باب سید سے تھوڑی دور آگے کم آباد علاقے تھے لیکن پھر بھی چاروں طرف زندگی پیر پسارے تھی ہر جگہ بیداری تھی ، پیڑ پودے تھے ، ہوا تھی، صاف و شفاف آسمان پر جھومتے بادل تھے اب تو ہر طرف انسانوں کا جم غفیر ہے لیکن قبرستان جیسی خاموشی ہر جانب ہے ، پر تکلف اور تصنع آمیز زندگی ہے ٹیں ٹیں ، پوں پوں کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اونچی اونچی عمارتیں گونگی اور بہری ہو گئی ہیں ۔ گولی چلے کان پڑی آواز سنائی نہ دے اور قتل ہو جائے۔ یہ بیچارے تہذیب یافتہ لوگ نہ گالی

دیتے ہیں۔ نہ لڑتے ہیں۔ خاموشی کا سانپ ان کے سر پر سوار ہے۔ یہ بے حس بازارِ اساس کی پوش کالونی جہاں جذبا ت کا لین دین تول سے ہوتا ہے۔ علم سے بھرا تنگ ذہن دوسروں کی نجی زندگی اور تنہائی اور آزادی میں مخل نہیں ہوتا، مانو سب دماغ سے ہوتا ہے۔

کل میں تمہارے پرانے شہر اپنی پھوپھی سے ملنے گئی تھی۔ کچھ نہیں بدلا۔ وہی تکلف اور بناوٹ سے عاری زندگی، بدتمیز لوگوں کی زندہ بستی، چلتے پھرتے، چیختے چلاتے بھوکے لوگ جو ایک دوسرے کا غم مفت میں بانٹتے ہیں۔ بے علم، بے دماغ، منھ پھٹ نہ رونے میں تکلف نہ ہنسنے پر پابندی۔ ہر آنے جانے پر نظر، ایسی نظر جو جدید طرز کا لباس پھاڑ کر چھپے اعضاء کی بھی پیمائش کر لے۔ گفتار گالی گلوچ جیسی، نگاہ گدھوں جیسی قوت شامہ کتوں جیسی چاروں طرف کتے بھونکنے کی آوازیں، کبوتروں کی غٹرغوں، بلی کی میاؤں میاؤں سے سونے والے جاگ جائیں، یہ سب دل سے ہوتا ہے۔ میرا دل بے چین ہو گیا ہے۔ فردوس سو رہی ہے میری آنکھیں جاگ رہی ہیں۔ سونے سے پہلے اس نے کہا تھا کافی عرصہ کے بعد اپنے ملک میں گہری نیند سوئی ہوں ورنہ خوف اور خدشات نے آنکھوں کی نیند چھین لی تھی۔ کراچی حادثاتی شہر ہے صبح کا نکلا شام کو حفاظت سے لوٹ آئے تو غنیمت جانئے

''پاکستان بھی عجیب وغریب ملک ہے جس کی بنیاد مذہب پر ٹکی ہے'' میں نے کہا

''ہندوستان بھی عجیب وغریب ہو گیا ہے جبکہ اس کی اساس سیکولیرزم ہے'' اس نے کہا

''دراصل فساد اور دہشت گردی مذہب سے جڑی ہے''

''یہ سب قصور دانشوری کے زعم میں کئے گئے غلط فیصلے کا ہے''

''اسی لیے مقتدر اعلیٰ کی زمین پر زمین کے لیے فساد ہوا''

''ہاں وہ سلسلہ دہشت گردی کی شکل میں آج بھی دراز .....''

''دہشت گردی ملک کے آئین کی خلاف ورزی ہے''

''وہ چاہے زبانی ہو یا عملی، دہشت پسندی ہے''

''فسادات خود دہشت گردی کے ہم معنی ہیں کیونکہ اس میں معاشی اور معاشرتی دونوں ہی نقصان ہوتے ہیں''

''سلطان بننے کی کوشش میں یہ انسان نہیں رہتے'' اس نے کہا

'' سلطان ہونے کے لیے پہلے انسان بننا ضروری ہے'' میں نے کہا

خاموشی کی کالی چادر میں رات آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے دیوالی ہو چکی ہے گلابی سردی نے اپنے پر پھیلا دیئے ہیں۔ فردوس کی مسہری کھڑکی کے قریب ہے خنک ہوا کے سبک جھونکوں پر اس کے گیسو محو رقص ہیں۔ میں نے چہرے سے بکھرے بالوں کو ہٹایا اور اپنے ہونٹوں کو جیسے ہی پیشانی پر رکھنے کی کوشش کی اس کی آنکھ کھل گئی وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے گداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹنا چاہا وہ مسہری سے فرش پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھ گئی۔ خوف اور خفگی کے ملے جلے احساس کے باوجود بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے کہا'' سرحدیں صرف ملکوں کی نہیں ہوتیں..... ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی اچھی لگتی ہے۔ میں ثروت کی عزت کی امانت دار ہوں''

میں بت بنا، ہونٹوں پر جبریہ مسکراہٹ کے ساتھ گونگے بہرے کی طرح اسے تکے جا رہا تھا۔

☆☆☆

وسیم عقیل شاہ

افسانہ

آشواسن

اس کے پاؤں میں پڑے چھالے پھوٹنے لگے تھے، جن سے رسنے والا پانی پسینے سے مل کر شدید جلن پیدا کر رہا تھا۔ اس پر دھوپ کی تمازت اسے الگ بے حال کیے ہوئے تھی۔ اب ایک قدم بھی آگے بڑھانا اس کے لیے محال تھا، لیکن اس کا عزم ہی تھا جو اسے گھسیٹتے ہوئے جلوس کے ساتھ ساتھ لیے چل رہا تھا۔

سفر کی سرد و گرم صعبتوں اور مشقتوں کو برداشت کرتا ہوا، لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں لیتا ہوا ہزاروں کسانوں کا یہ جلوس سیکڑوں میل پیدل مارچ کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وشوا بھی اپنی پگڑی میں امیدیں باندھے اس جلوس میں شامل ہوا تھا۔ اسے بھی آس تھی کہ اب کے حکومت کی حس ضرور جاگے گی اور جلد ہی کسانوں کے مطالبات پورے کر دیے جائیں گے۔ اسی لیے وہ اس طویل سفر میں درپیش ہر تکلیف کو اپنے خوابوں کی خوش آئند تعبیر کے بدلے برداشت کرتا ہوا چل رہا تھا۔ اور مسلسل چل رہا تھا۔ راستے میں لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر اس کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور اس کے قدم خود بخود تیز ہونے لگتے، اتنے تیز کہ وہ علم اٹھائے، پیش پیش رہنے والے جلوس کے پرجوش نوجوانوں سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کرتا۔ یہ امیدیں ہی اس کے حوصلے اور راحت کا سبب بن رہی تھیں، وگرنہ اپنی بے فیض زندگی سے وہ گویا بجھ سا گیا تھا۔

اسے اپنی بیوی شکنتلا کے بے موت مرنے کا شدت سے احساس تھا۔ اگر پچھلے برس فصل کی قیمت اس کی محنت کے برابر آئی ہوتی تو وہ اس کا علاج صحیح ڈھنگ سے کرواتا اور شاید وہ بچ بھی جاتی! مگر بیماری کے بعد وہ جی ہی کتنا! نہ اس کے پاس وقت تھا نہ وشوا کے پاس کہ وہ پھر سے قرض کے لیے دوڑ بھاگ کرتا۔ حالانکہ اس کے ناتواں کاندھوں پر پہلے ہی قرض کا اتنا بوجھ تھا کہ وہ اگلا قرض لینے کا کسی بھی طرح سے اہل نہیں تھا۔ تب بھی اگر کوئی بینک یا ادارہ ترس کھا کر اسے قرض دیتا بھی تو ضابطے کی کاروائی پوری کرنے تک شکنتلا کے پاس وقت کتنا تھا! ۔۔۔! اسے لگتا تھا کہ شکنتلا، سندھیا ہی کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی اور مری بھی شاید اسے ہی دیکھ دیکھ کر۔ آخر وقت میں سندھیا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو حسرت آمیز کیفیت تھی اسے یاد کر کے وشوا کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔

سندھیا۔۔۔! اس کی سگھڑ بیٹی۔۔۔ سچ مچ وشوا کو پتا ہی نہ چلا کہ کھیتوں کی بالیوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اسے ستانے والی اس کی معصوم گڑیا کا بچپن، کب اور کس اوٹ کے پیچھے چھپ گیا! مگر اب جب کہ سندھیا پچیس کے اوپر ہو چلی تھی تو اس کے بڑھتے سن کا ایک ایک دن وشوا پر بھاری گزر رہا تھا۔

بھلا ہو ان نیتاؤں کا جنہوں نے کسانوں کو جاگرت کیا اور انہی کے حق میں ریاستی سطح پر ایک بڑے جلوس کا اہتمام کیا۔ تاکہ سرکار اور اس کے کارندوں کو کسانوں کے مسائل سے آگاہ کرایا جا سکے۔ سندھیا کو لیکر وشوا نے اپنی ساری امیدیں اور آشائیں اسی جلوس سے باندھ لی تھیں۔ اب تو اسے گویا یقین ہو چلا تھا کہ حکومت ان کا ساتھ دے گی اور فصل کے صحیح داموں میں خرید و فروخت کا قانون بنے گا، جس کی بنا پر اب کی بار اس کی تیار فصل کے دام مناسب آئیں گے۔ اور رہی بات قرض کی تو وہ سرکار سے پرامید تھا کہ یقیناً اس کا قرض معاف کر دیا جائے گا یا اطمنان کی حد

تک اس میں کمی کر دی جائے۔اس نے ایک موٹا موٹا حساب جوڑ کر یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ اگلے چھ، آٹھ مہینوں میں اس کے پاس اتنی رقم جمع ہو سکتی ہے جس سے سندھیا کے جہیز اور لگن کا ٹھیک ٹھاک بندوبست ہو جائے گا۔اسی لیے جلوس میں شامل ہونے سے ہفتہ بھر پہلے ہی وہ گاؤں کے رشتہ لگانے والے 'کرتا' سے ملا تھا اور اسے پیشگی ہزار روپیے دے کر سندھیا کے لیے اچھا سا لڑکا ڈھونڈنے کی منتیں کی تھیں۔

پانچ دنوں کے طویل سفر کے بعد جلوس اپنے مقام پر پہنچا۔رات کو منتظمین اور کچھ فلاحی اداروں کی جانب سے جھنکا بھا کر کھانے کی دوسری اشیا تقسیم کی گئیں۔اسے زہر مار کر کے سبھی تھکے ہارے کسانوں نے سوتے جاگتے رات گزار لی۔صبح کو جلوس کے اہم لیڈروں نے منتریوں اور سرکاری نمائندوں سے تین گھنٹے کی طویل میٹنگ کی، پھر جب باہر آئے تو یہ بھاشن دیا۔

" دیش واسیوں کے لیے اَناج پیدا کرنے والے ہر ایک کسان کا مسئلہ اس کا اپنا ذاتی نہیں بلکہ پورے دیش کا مسئلہ ہے ۔سرکار مانتی ہے کہ سبھی کسانوں کے مسائل ایک جیسے ہیں لیکن ان میں ہر ایک کی ذمہ داریاں مختلف ہیں۔لہذا اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکار نے کسانوں کی آدھی سے زیادہ مانگوں کو قبول کر لیا ہے اور آشواسن دیا کہ اگلے چھ مہینوں بعد ان پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے گا۔اس کے علاوہ بقیہ مانگوں پر غور کرنے کے لیے ایک سال کی مدت لی ہے تا کہ ان مانگوں پر ہر پہلو سے غور کیا جا سکے"۔

سرکاری فیصلے سے ہجوم پر کہیں خوشی تو کہیں غم کی لہر دوڑ گئی۔ بیشتر کسانوں کے مطابق اس فیصلے میں سوائے واپسی کے لیے سفری انتظامات کرنے کے، ہر ایک مدعا آشواسن تھا۔ اور آشواسن کا لفظ خاص کر کسانوں کے لیے کبھی بھی نیا نہیں رہا بلکہ آشواسن کے معنی ان کے نزدیک صرف انتظار۔۔۔۔انتظار۔۔۔ اور انتظار کے سوا کچھ نہیں تھا۔

فیصلہ سنتے ہی وشوا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور بدن پر لرزا طاری ہو گیا۔وہ سر تھامے کپکپاتے پیروں سے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔پتا نہیں وہ کتنی دیر اسی کیفیت میں بیٹھا رہا کہ اچانک اس نے اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سامنے ایک شخص کھڑا تھا، اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

''ارے وشوا، کیا تو نے مجھے پہچانا نہیں میں کیشو ہوں کیشو''۔

کیشو کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں شناسائی اتر آئی اور دونوں دوست بغل گیر ہو گئے۔

کیشو نے بتایا کہ وہ بارہ پندرہ برسوں سے دور کے ایک گاؤں میں اپنے سسرال کی زمین پر کاشت کار رہا ہے اور اب وہیں بس گیا۔ پھر اس نے وشوا کے اترے ہوئے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا:

''تیرا کیا حال ہے؟''

وشوا نے افسردگی سے اپنی بیوی کی موت کی خبر سنائی۔سن کر کیشو نے بڑا افسوس ظاہر کیا اور کچھ توقف کے بعد پوچھا:

''تیری ایک بٹیا بھی ہے نا؟ کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟

''سندھیا''۔

وشوا نے جواب دیا:

''ہاں، سندھیا۔۔۔اب تو شادی ہو گئی ہوگی اس کی۔۔؟''

وشوا نے مایوسی سے گردن ہلائی اور دھیمی آواز میں کہا:

''اسی کی فکر ستا رہی ہے مجھے''۔

وشوا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے بارے میں اسے کچھ بتائے مگر کیشو کی ضد کے آگے وہ مجبور ہو گیا۔

کیشو نے پوری بات سن کر اسے غور سے دیکھا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا:

''وشوا، چنتا مت کر سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''نہیں رے کیشو تو نہیں جانتا مجھے اپنی کھیتی سے زیادہ سندھیا کی فکر ہے اور تو تو جانتا ہے آج کل لڑکے والے 'ہنڈا' (روپیوں کی شکل میں دیا جانے والا جہیز) لیے بغیر کہاں راضی ہوتے ہیں۔

تبھی پیچھے سے ایک نوجوان نے کیشو کو آواز دی۔ چلو بابا دیری ہو رہی ہے، کہیں بس نہ نکل جائے''۔

کیشو نے دیکھا ایک اچھے قد و قامت کا نوجوان کیشو سے مخاطب ہوا اور پلٹ کر پاس ہی کھڑے اپنے دوستوں کی طرف بڑھ گیا۔

''وشال ہے نا۔۔۔؟ کتنا بڑا ہو گیا۔۔۔۔۔۔!''

کیشو نے دیکھا وشوا کی نظریں وشال کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں، میرا بیٹا۔۔۔۔۔۔ وشال۔۔۔۔'' اسی برس شادی کرنے جا رہا ہوں اس کی''۔

وشوا نے تجسس سے پوچھا:

''لڑکی دیکھی؟''

''ہاں دیکھی تھی، پندرہ برس پہلے۔۔۔۔۔''

کیشو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس پر وشوا نے حیرت سے پوچھا:

''پندرہ برس پہلے۔۔۔۔ کہاں دیکھی تھی؟''

''تیرے گھر میں''۔

وشوا حیرت و مسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کیشو کا منہ تکنے لگا۔

''اب منہ کیا دیکھتا ہے جلدی سے اپنے گاؤں کی بس پکڑ اور چنتا چھوڑ میں جلد ہی تیری وینی کو لے کر سندھیا کا ہاتھ مانگنے تیرے گھر آؤں گا۔ ''

مائک سے مسلسل آنے والی آوازیں اب بند ہو چکی تھیں البتہ دس دس منٹ بعد ہدایتی پیغام ضرور آ رہے تھے۔ میدان دھیرے دھیرے خالی ہونے لگا تھا۔ جلوس میں شامل کسان جوق در جوق ریلوے اسٹیشن اور بس اڈے کی طرف چلے جا رہے تھے۔

کیشو کی باتوں سے وشوا کی ڈھارس بندھی۔ وہ بس میں سوار ہوا اور جگہ بنا کر ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس چلنے لگی تو کھڑکی سے آتی ہوا سے وشوا کو راحت کا احساس ہوا اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور کیشو کے بارے میں سوچنے لگا۔ کتنا بھلا آدمی ہے کیشو، پرانی دوستی کا مان رکھ لیا اور میری اتنی بڑی پریشانی دور کر دی۔ وہ اس دن کا تصور کرنے لگا جس کا آشواسن کیشو نے دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ سندھیا کا ہاتھ مانگنے اس کے گھر آئے گا اور وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔ اچانک ایک منحوس سا خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا'' کہیں کیشو کا آشواسن بھی سرکاری آشواسن کی طرح صرف انتظار۔۔۔۔۔ انتظار۔۔۔۔ اور انتظار ہی نہ رہ جائے !

☆☆☆

رعائتی نرخ پر

ادیبوں و شاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

مطالعہ

ادب وثقافت: ایک معروضی جائزہ

مولانا آزاد قومی اُردو یونیورسٹی کے ذمہ داران بالخصوص شش ماہی مجلّہ ''زبان و ادب'' کے مکرمی مدیر پروفیسر محمد ظفرالدین صاحب مبارک بادی کا استحقاق رکھتے ہیں کہ انہوں نے اُردو زبان و ادب اور ثقافت سے متعلق ایک باوقار مجلّہ کی اشاعت کوممکن بنایا ہے اور سنجیدہ تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے اسکالرز کوایک قومی سطح کا پلیٹ فارم دستیاب کرایا ہے۔

میں ذاتی طور پر ان ذمہ داروں کا نہایت ہی شکر گزار ہوں کہ ''ادب وثقافت'' نعمتِ غیر مترقبہ کی صورت میں مجھ ناچیز کو متواتر موصول ہو رہا ہے۔اس مجلّہ کا پانچواں شمارہ زیرِنظر ہے۔ یہ شمارہ اس لیے بھی میرے لیے اہم ہے کہ اس میں راقم کا بھی ایک عدد مقالہ شامل ہے۔

میں ذاتی طور اس مجلّہ کو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی علمی اور ادبی اہداف کا ترجمانِ اعلیٰ متصور کرتا ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس جامعہ کے شعبۂ اُردو سے اعلیٰ پایہ کا تحقیقی اور تنقیدی نیز علمی و ادبی نوعیت کا جریدہ نکلتا جو آگے چل کر اُردو کے حوالے سے شعبہ اور جامعہ دونوں کا شناخت نامہ تصور کیا جاتا لیکن شومئ قسمت یہ کہ تا ایں دم اس طرح کی کسی کوشش کی کوئی عملی شکل نظر نہیں آتی۔ اب جب کہ جامعہ کے ایک دوسرے شعبہ ''اُردو زبان، ادب وثقافت'' نے ''ادب وثقافت'' کے نام سے مجلّہ کی اشاعت کا خوشگوار سفر شروع کیا تھا جو اس کے مناصب واہداف کے عین مطابق نظر آتا تھا لیکن کچھ ہی بہاروں کی رنگینی اور رعنائی کی جھلکیاں دکھا کر وہاں سے ایک دوسرے شعبہ کو منتقل کیا گیا جس کی منطق کم سے کم مجھے سمجھ نہیں آئی اور سچ پوچھیے تو میں جاننا بھی نہیں چاہتا ہوں۔اب یہ مجلّہ 'نظامتِ ترجمہ کاری واشاعت' کے تحت شائع کیا جا رہا ہے اور تا حال اس کا اشاعتی سفر اطمنان بخش صورت میں جاری ہے۔

متذکرہ بالا غیر دلچسپ اور غیر ضروری تمہید باندھنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ اس مجلّہ کی پیشانی پر کچھ ایسے انگریزی حروف (جو کہ اُردو رسم الخط میں ہیں) نظر آ رہے ہیں جو مجھے اور میرے کئی ہم خیالوں کو اس لیے پسند نہیں آ رہے ہیں کہ ان کے اُردو متبادلات بہ آسانی موجود ہیں یا ہو سکتے ہیں۔انگریزی الفاظ کے اُردو متبادلات کی بات اس لیے ذہن میں آ رہی ہے کہ یہ مجلّہ 'نظامت ترجمہ کاری واشاعت' سے شائع ہو رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہ لکھنے کی ہمت اس کا اداریہ پڑھ کر ہی ہوئی جس میں شفیع مشہدی نے مدیر کی توجہ ریسرچ اور ریفریڈ کے اُردو ترجمہ کی جانب مبذول کرائی ہے۔

اس ضمن میں میری عاجزانہ رائے ہے کہ مکرمی مدیر نے مشہدی صاحب کے مدلولات کا جواب صحیح طریقے سے نہ دے کر دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہے، جو نامناسب بھی ثابت ہوئی اور نامعقول بھی۔ وہ (شفیع مشہدی) مدیر سے کہتے ہیں کہ'' ' ایڈیٹوریل بورڈ'، 'ریسرچ اور ریفریڈ جرنل' جیسے الفاظ کے لیے اُردو متبادل دیا جا سکتا ہے'' جس کے جواب میں آپ نے ترجمہ نگاری کی تاریخ کھنگالنے کے بعد اس نتیجے پر تان توڑی ہے کہ 'فریکوئنسی' کو 'تعدد'، 'وائر س ' کو 'تشبات' اور 'ڈی ہائڈریشن' کو 'نا آبیدگی' کہنے لگیں گے تو ہمارا طالب اور قاری دونوں مخمصے کے شکار ہو جائیں گے۔ میں حیران ہوں کہ مدیر

موصوف نے کس طرح انگریزی کی علمی اور ادبی اصطلاحات کا اُردو متبادل تلاش یا استعمال نہ کرنے کی کون سی منطق ڈھونڈ نکالی ہے۔ انگریزی میں ہی مشہور ہے کہ:

to compare apples with mangoes، مدیر نے بالکل یہی کیا ہے۔ مشہدی صاحب نے اِن سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ طب یا طبعیات کی رائج الوقت انگریزی اصطلاحات کا اُردو متبادل تلاش کریں بلکہ خالص ادبی اصطلاحات کے اُردو متبادلات استعمال کرنے کی بات کی تھی۔ اب ان اصطلاحات کے اُردو متبادلات بھی ملاحظہ فرمایئے جن کے عنقا ہونے پر آپ خود کو مجبور پاتے ہیں:

﴿ایڈیٹوریل بورڈ: مجلسِ ادارت (یہ اصطلاح بہت سارے مجلّات میں درج ہوتی ہے، کشمیر یونیورسٹی کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے شائع ہورہے ''ترسیل'' کے ہر شمارے میں یہ دیکھی جاسکتی ہے۔ اور دوسرے کئی مجلّات میں بھی اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

﴿ریسرچ اور ریفریڈ جرنل: تحقیقی وحوالہ جاتی مجلّہ (حوالہ جاتی سے مراد اس مجلّہ میں شامل مقالہ جات کے مندرجات اور تحقیقی نتائج کے صحیح ہونے کے حوالے سے ماہرین نے تصدیق کی ہے۔ اور 'ریفریڈ' لکھ کر ہم یہی مراد لیتے ہیں۔

﴿ایڈیٹر: مدیر (یہ لفظ اُردو میں اتنا عام ہے کہ جس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ثانوی درجات کے طالبِ علم بھی اس کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ اب یہ کہاں اجنبی اور ثقیل ہے۔

﴿ڈائریکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز: (ا): نظامتِ ترجمہ کاری واشاعت (اس نام کا میری ناقص فہم میں یہی ترجمہ ہوسکتا ہے اور یہ ادارے کے حسبِ حال ہے۔)

اِن گزارشات کے ضمن میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اگر متذکرہ بالا اصطلاحات کا یہی اردو ترجمہ کیا جائے تو اس مجلّہ کے قارئین ایسے الفاظ سے خوب شناسائی حاصل کریں گے۔ اب اگر ایک آدھ نیا لفظ یا اصطلاح بھی اس مجلّہ کی وساطت سے سننے کو ملے تو اس میں کیا حرج ہے۔ بلکہ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس شعبہ کے بنیادی کاموں میں ایک کام نئی اصطلاحات، تراکیب، الفاظ اور محاورے وضع کرنا بھی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی ہندوستان کی واحد یونیورسٹی ہے جو اُردو کی ترویج اور ترقی کے مقصد سے معرضِ وجود میں آئی ہے اور اس کے لیے وہ کچھ نئے کاموں کی طرح بھی ڈال سکتی ہے جس کا اُردو حلقوں میں استقبال کیا جانا چاہیے۔ اب اگر اس مجلّہ سے وابستہ عملہ اپنے ہی شعبہ کے اردو متبادلات تلاش یا استعمال کرنے میں تساہل سے کام لیں گے تو محبانِ اُردو کی توقعات کیسے ابھر سکتیں ہیں۔

انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہم جس شخص کے لیے ترجمہ کررہے ہیں وہ اُردو ہی کا عام قاری یا تربیت یافتہ قاری یا باذوق قاری ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم ترجمہ ہندی قاری یا بنگلہ قاری یا مراٹھی قاری کے لیے نہیں کررہے ہیں جسے اُردو زبان کے نئے الفاظ اجنبی یا ثقیل معلوم ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مجلّہ سے اُردو کے عام قاری کو بھی کوئی تعلق نہیں بلکہ اس سے اُردو کے سنجیدہ ادیب اور کالج اور یونیورسٹی سطح کے اساتذہ اور تحقیقی طالبِ علموں کو ہی واسطہ ہے۔

اس شمارے میں مقالہ جات کی ترتیب آپ کے حسنِ انتخاب اور انتخابِ حسن دونوں کی مظہر ہے۔ البتہ اکثر مقالوں میں یا تو سرے سے حوالہ جات نہیں ہیں یا تحقیقی طریقۂ کار کے عین مطابق نہیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اساتذہ کے مقالوں میں بھی

حوالے موجود ہوں کیوں کہ اساتذہ کبھی کبھار اپنے حاصلِ مطالعہ اور وسیع تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر مقالہ ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں پھر بھی 'کتابیات' درج ہونے چاہئیں لیکن زیرِ نظر شمارے میں مجموعی طور پر مقالہ نویسی کے جدید طریقوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ پروفیسر افصح ظفر، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر علی رفاد فتیحی ، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر مصطفیٰ علی خان فاطمی، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر محمد مستمر کے مقالہ جات میں کوئی حوالہ موجود نہیں۔ تحقیق کے جدید طریقہ ہائے کار کی جانب اساتذہ کی عدمِ توجہی نئے لوگوں کے لیے مسائل بھی کھڑا کر دیتی ہے جس سے مجموعی طور پر تحقیقی کام ہی متاثر ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مدیر مکرم نے مجھے اپنا مقالہ، جو میں نے اس شمارے کے لیے ارسال کیا تھا، یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ اس میں حوالہ جات درج نہیں ہیں، اس کے بعد میں نے تمام تر تحقیقی اصولوں اور طریقہ ہائے کار کے مطابق دوسری بار ارسال کیا۔ میں امید کرتا تھا کہ اس شمارے کے سارے مقالے تحقیقی طریقہ کار کے مطابق ہوں لیکن اس سطح پر مایوسی ہوئی۔

زیرِ نظر شمارے میں پروفیسر افصح ظفر نے ادب ، تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے اچھی بحث کی ہے۔ ان کے مطابق آج بہت سارے ادیب اور شاعر ادب کے تخلیق کرنے کے لوازمات کسی حد تک عاری نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ ادب تخلیق کرتے ہیں اور اُردو زبان و ادب کے دائرے کو حتی المقدور وسعت عطا کرتے ہیں۔ موصوف نے تہذیب اور ثقافت، جنہیں اکثر طلبہ ہی کیا اساتذہ بھی ایک ہی تصور کرتے ہیں، کی اچھی طرح وضاحت کی ہے:

''انسانی تہذیب جب اپنی تلاش میں آخری مرحلے تک پہنچتی ہے تو اس پر کلچر یعنی ثقافت کی مہر لگائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ تہذیب اپنے مراحل کے آخری سرے پر ہے ۔عملاً کہتے ہیں کہ مادّی اور روحانی قدروں کی جب تصدیق ہو جاتی ہے تو کلچر کو ہم کو سمجھنے اور پرکھنے لگتے ہیں ۔ سچ پوچھیے تو مادّی اور روحانی الفاظ اصطلاحی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ ان سے دونوں کی قدر کا ثبوت ملتا ہے ۔ مادّی اور روحانی اصطلاح بے حد معنی خیز ہے۔''[۲]

پروفیسر حسین الحق نے افسانہ ''پروائی'' کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے لیکن اگر افسانے کا متن بھی شاملِ مجلّہ ہوتا تو اس کے حوالے سے گفتگو ممکن ہوتی۔

اس شمارے میں پروفیسر خواجہ اکرام کا مقالہ'' چند ہم عصر کہانیاں اور ان کے سماجی سروکار'' بھی شامل ہے۔ موصوف نے چند ہم عصر کہانیوں کے سماجی سروکاروں پر بات کرتے ہوئے صحت مند اشارے کیے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کے افسانوں کے انتخاب میں علاقائیت غالب رہی ہے۔ مثال کے طور پر شموئل احمد، غضنفر، حسین الحق، شفیع مشہدی، مشتاق احمد نوری کو ہی مطالعہ کے لیے منتخب کرنا کسی بھی طرح جائز نہیں۔ سماجی سروکار کو پیش کرنے کے لیے ہندوستان گیر تخلیق کاروں کی کہانیوں پر بات ہونی چاہئے تھی۔ اس مضمون میں سید محمد اشرف اور سلام بن رزاق کا ذکر بس وزن برابر کرنے والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے مقالہ کی تمہید میں اُردو افسانہ کی عمر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''اُردو افسانہ کی عمر تقریباً دو سو سال کی ہے''[۳]

میں ذاتی طور پر مقالہ نگار سے اس نکتے پر بھرپور وضاحت چاہتا ہوں۔

اس شمارے کے کچھ مقالے بالخصوص خالد اشرف کا

مقالہ پڑھا جو ان کے دوسرے مقالوں کی طرح بہت ہی معلوماتی ہے۔موصوف نے اختر الایمان کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''اختر الایمان نے یہ کہا تھا کہ فیض کے یہاں superficiality ہے اور Deep Peneration نہیں ہے۔۔۔۔۔۔لیکن یہ بھی فیض کے قبولِ عام کے سامنے اختر الایمان کا احساسِ کمتری ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ وسعتِ خیال اور تعمقِ فکر کے لحاظ سے بہت بلند شاعر ہیں اور ان کا تقابل اُردو میں اگر کسی ہم عصر شاعر سے کیا جا سکتا ہے تو وہ ن۔م۔راشد ہیں، اختر الایمان نہیں!''[۴]

یہ اقتباس بالخصوص اس کا آخری حصہ کئی نئے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ حالاں کہ اُردو نظم کی تاریخ میں تینوں یعنی فیض، راشد اور اختر الایمان اپنی اپنی منفرد خصوصیات کی بدولت مقبول ہیں اور جس طرح ایک انسان اپنے امتیازات کی وجہ سے دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہوتا ہے اسی طرح فیض، راشد اور اختر الایمان ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی۔ان تینوں کے ضمن میں خالد اشرف کے بیانات دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

اس دور میں میں کچھ لوگوں کی نثر کو بہت پسند کرتا ہوں جن میں ایک اہم نام اسیم کاویانی کا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں ان کا مقالہ ''مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری: ایک جائزہ'' بطورِ خاص پڑھنے کو ملا۔ حالانکہ اس موضوع پر آج تک بہت کچھ پڑھنے کو ملا لیکن موصوف نے جس نکتہ رسی سے مجتبیٰ حسین کی فن کاری کا جائزہ پیش کیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ اس ضمن میں مندرجی ذیل اقتباس خصوصی طور پر پیش کرنا چاہوں گا:

''مجموعی طور پر مجتبیٰ حسین کی زبان بے عیب نظر آتی ہے۔ روانیِ بیان اور شگفتگیِ تحریر کا سحر ایسا ہے کہ بہت کم مقام ایسے نظر آئے کہ جہاں ذہن ٹھٹکا ہے اور کوئی لفظ کھٹکا ہے۔ راقمِ تحریر یہاں پر اپنے ایسے ہی چند شبہات کا اظہار کرنا چاہتا ہے حالانکہ عین ممکن ہے کہ راقم کی ہیچ مدانی ہی کی قلعی کھُل کر رہ جائے، پھر یوں بھی راقم ٹھہرا آہنگر زادہ، وہ کہاں اور رموزِ آدابِ زبان دانی کہاں!''[۵]

اس اقتباس میں جہاں اسیم کاویانی نے مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے حوالے سے زبان کا تجزیہ کیا ہے وہیں اپنے آہنگر زادہ ہونے کا بھی اظہار کیا ہے۔ میں اس ضمن میں عرض کرنا چاہوں گا کہ میں بھی اسیم کاونی کا ہم کار ہوں اور مجھے تو بالکل ہی آدابِ زبان دانی کی ہوا نہیں لگی ہے۔

امید کرتا ہوں کہ اُردو یونیورسٹی کا یہ واحد مجلّہ اُردو تحقیق وتنقید میں وحید العصر ہو کر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ یہی میری خواہش بھی ہے اور دعا بھی۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ سرورق، ادب وثقافت، شش ماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل، ڈائریکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، شمارہ۔۵

۲۔ کلچر ادب اور جنگ، از پروفیسر افصح ظفر، مشمولہ ادب وثقافت، شش ماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل، ڈائریکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، شمارہ۔۵، ص۔۱۱

۳۔ چند ہم عصر کہانیاں اور ان کے سماجی سروکار از پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، ایضاً، ص۔۶۵

۴۔ اختر الایمان کی شاعری کی قدر شناسی از ڈاکٹر خالد اشرف، ایضاً، ص۔۱۳۴

۵۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری: ایک جائزہ از اسیم کاویانی، ایضاً، ص۔۱۰۵

جو وہ لکھیں گے جواب میں

مکرمی پروفیسر بیگ احساس صاحب!

سب رس مارچ 2018ء ملا۔ ہمیشہ کی طرح اداریہ پر مغز ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی تقاریب کی تصویریں دیکھیں جی خوش ہو گیا۔ آپ یقیناً اس ایوارڈ کے حق دار ہیں۔ ''ایوارڈ یاترا'' مزادے گئی۔ آپ نے کہیں خودستائی سے کام نہیں لیا۔ ساری روداد بہت سنبھل سنبھل کر لکھی جیسا کہ آپ کا مزاج ہے۔ ملیالم کے ایوارڈ یافتہ فن کار نے اپنا ایوارڈ جنید کی ماں کو دے کر ہندوستانی تہذیب کی لاج رکھ لی۔ ایسے ہی جیالوں اور انصاف پسند ادیبوں کی وجہ سے ہمارے مثبت اقدار باقی ہیں۔ دیگر مشمولات بھی معیاری ہیں۔ ہر ماہ مجتبیٰ حسین صاحب پر مضمون شائع کر کے آپ جانب داری سے کام تو نہیں لے رہے ہیں؟

مرتضیٰ قادری۔ پٹنہ

محترم پروفیسر بیگ احساس صاحب____ تسلیمات!

مسلسل سفر میں رہنے کے باوجود آپ نے بڑا خوب صورت شمارہ نکالا ہے۔ حلیمہ فردوس اور مسرت جہاں کے مضامین اچھے ہیں۔ رانی صاحبہ نے ہندی شاعری سے متعارف کروایا ہے۔ آپ کی ایوارڈ یاترا پڑھ کر لطف آیا۔ ایسا لگا جیسے ہم بھی تمام تقاریب میں شریک ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کی تقاریب کے بارے میں ہمیں علم نہ تھا۔ دلّی جیسے شہر میں کسی بھی سیاست داں پر اپنے ادیبوں کو ترجیح دینا ساہتیہ اکادمی کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ ایک زمانے کے بعد ایسا لگا جیسے حق بہ حقدار رسید!! اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!! شاعری کا حصہ بھی جان دار ہے۔

اصفیہ بانو۔ بنگالورو

پروفیسر بیگ احساس صاحب!

شام کے حالات پر آپ نے عمدہ اداریہ تحریر کیا ہے۔ عرب ممالک کی دولت اور وسائل رکھتے ہوئے بھی بے بس اور کمزور ہیں۔ اب سعودی عرب، اسرائیل سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ یمن، سعودی عرب پر حملے کر رہا ہے۔ روس اور ایران کا جو رول ہے وہ دنیا جانتی ہے۔ افغانستان میں سینکڑوں حفاظ دستار بندی کی رسم کے وقت لقمہ اجل بن گئے۔ میڈیا نے اس پر مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ ایک ایک کر کے سارے عرب ممالک ختم ہو جائیں گے اور دنیا تماشا دیکھتی رہے گی۔ آپ نے جس دردمندی کا اظہار کیا ہے اس کے لیے مبارک باد! میں نے عالمی یوم مادری زبان، کے دن مغربی بنگال اردو اکادمی، میں آپ کو دیکھا اور سنا ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ آپ جیسے دانشوروں کی عمر دراز کرے۔

اشتیاق حیدر۔ کلکتہ

جناب بیگ احساس صاحب!

سب رس دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ایک طرح سے آپ نے ایوارڈ نمبر نکالا ہے اور کیوں نہ ہو۔ زندگی میں ایسے یادگار لمحے بار بار نہیں آتے۔ انھیں محفوظ کر لینا چاہیے۔ ''ایوارڈ یاترا'' نے معلومات میں اضافہ کیا۔ اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مجموعی خدمات پر دیا جاتا ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ پانچ سال کی کتابوں میں کسی ایک کتاب کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ ایوارڈ یاترا سے کئی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ اللہ کو حاسدین اور شر پسندوں سے محفوظ رکھے۔ اردو ادب کا آج کا جو ماحول ہے اس میں شرفا کی دستار کا سلامت رہنا بہت دشوار ہے۔

حور فاطمہ۔ حیدرآباد

ناسک اور مالیگاؤں میں ممتاز مزاح نگار فیاض احمد فیضی کی تازہ تصنیف ''بال کی کھال'' کی اجرائی تقریب
حیدرآباد سے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور پروفیسر بیگ احساس اور ممبئی سے سلام بن رزاق اور عبدالاحد ساز کی شرکت

گذشتہ ہفتے معروف مزاح نگار فیاض احمد فیضی کے تیسرے مجموعۂ مضامین ''بال کی کھال'' کی رسمِ اجرا کی تقریبات کا انعقاد مہاراشٹر کے دو شہروں ناسک اور مالیگاؤں میں کیا گیا۔ پہلے ۲/مارچ کو ناسک میں فن کار ٹرسٹ ممبئی اور کُسما گرج پرتشٹھان کے اشتراک سے سواگت آڈیٹوریم میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، مدیر شگوفہ حیدرآباد کی صدارت میں پروفیسر بیگ احساس، مدیر ماہ نامہ سب رس حیدرآباد کے ہاتھوں کتاب کی رسمِ اجرا انجام دی گئی۔ مہمانوں کا استقبال فن کار ٹرسٹ ممبئی کے صدر نشین سلام بن رزاق نے کیا۔ چیف گیسٹ کے طور پر شری رام چندر کلکرنی، کمشنر آدیواسی ڈیولپمنٹ، حکومت مہاراشٹر شریک تھے جنھوں نے صاف وشستہ اردو میں تقریر کر کے شرکا کا دل جیت لیا۔ عبدالاحد سازؔ، ظہیر قدسی اور مختار یوسفی نے مصنف کی خدمت میں منظوم مزاحیہ خراجِ تحسین پیش کیا۔

اگلے روز اسکس لائبریری، مالیگاؤں میں جناب سلام بن رزاق کی صدارت میں کتاب کی رونمائی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ تقریب کا اہتمام زندہ دلانِ مالیگاؤں، اسکس لائبریری اور مالیگاؤں آرٹس اینڈ کلچرل ایسوسی ایشن کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ پروگرام کے آغاز میں آصف سبحانی، ڈاکٹر الیاس وسیم صدیقی اور شبیر آصف نے فیاض احمد فیضی کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل مضامین سنائے جنھیں سامعین نے داد وتحسین سے نوازا۔ ناسک کے مشہور شاعر ناصر شکیب جو ناسازیِ طبع کے سبب پروگرام میں شریک نہ ہو سکے، ان کے تحریر کردہ قطعات کو عثمان غنی اسکس نے پیش کیا۔ اس کے علاوہ مختار یوسفی، ظہیر قدسی اور عبدالاحد ساز نے مزاحیہ کلام سے مصنف کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

رسم رونمائی کے فوراً بعد ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اپنی تفصیلی تقریر میں اہلیان مالیگاؤں کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ جس طرح انھوں نے اپنی مادری زبان سے جو رشتہ قائم رکھا ہے وہ بے مثال ہے۔ چند برس قبل اردو میلے میں جس طرح مالیگاؤں نے ایک کروڑ روپے سے زائد رقم کی کتابیں خریدنے کا جو ریکارڈ قائم کیا اسے توڑنا دوسرے شہروں کے لیے بے حد مشکل ہے۔ انھوں نے فیاض احمد فیضی کی مزاح نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے تین کتابیں لکھی ہیں مگر اپنا معیار قائم رکھا ہے جو ملک کے کسی بھی سینئر مزاح نگار کی برابری کر سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا اندازِ نگارش سب سے جدا ہے اور وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ طنز اور مزاح کی جو خوشگوار آمیزش فیاض احمد فیضی کے ہاں ملتی ہے وہ خال خال ہی دوسرے مزاح نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ انھیں تخلیقی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور وہ اپنے ہمہ جہتی مشاہدے اور وسیع تجربے کو اس خوبصورتی سے طنز ومزاح کی انوکھی فضا تخلیق کرنے میں استعمال کرتے ہیں کہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ بہت جلد ان کا شمار ہند وپاک کے صاحبِ اسلوب مزاح نگاروں میں ہونے لگے گا۔

پروفیسر بیگ احساس نے فرمایا کہ جو لوگ ہندستان میں مزاح نگاری کے مستقبل سے مایوس ہیں، انھیں فیاض احمد فیضی کی تصنیف 'بال کی کھال' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ آج بھی ہمارے ہاں معیاری اور شستہ مزاح لکھا جا رہا ہے۔ فیاض احمد فیضی نے موضوعات، اسلوب، زبان وبیان ہر معاملے میں اپنی ایک نئی راہ تلاش کی ہے۔ وہ دوسروں سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں، اسے اپنے گہرے مشاہدے سے صیقل کرتے ہیں اور پھر شستہ اور نکھری ہوئی زبان اور اپنے مخصوص اندازِ بیان سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کی مشاقی اور انفرادیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ فیاض احمد فیضی نے مضامین کے علاوہ خاکے اور سفرنامے بھی لکھے ہیں جن کا شمار اردو کے بہترین خاکوں اور سفرناموں میں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انھوں نے نثری پیروڈی لکھنے میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ ''مقدمہ فلمی شعروشاعری'' اور 'میرے دوستوں کو مجھ سے بچاؤ'' بہت متاثر کن پیروڈیاں ہیں۔ سفرناموں میں وہ قاری کو اپنے ساتھ اہم ملکی اور غیر ملکی مقامات کی سیر اس طرح کراتے ہیں کہ وہ قدم قدم پر تحیّر آمیز مسرت کے مزے لُوٹتا ہے۔ آج جب کہ سینئر مزاح نگاروں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے، طنز ومزاح کی مشعل فیاض احمد فیضی کو سنبھالنی ہوگی تاکہ ہم اس کی روشنی میں تادیر زندگی کی مشکل اور صبر آزما گھڑیوں کا مقابلہ مسکراہٹوں کے ساتھ کر سکیں۔

سلام بن رزاق نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ فیاض احمد فیضی ایک ایسے مزاح نگار کا نام ہے جو بڑی سے بڑی بات کو آسان لفظوں میں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ ہمیں قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں کرتے لیکن زیرلب تبسم کے ساتھ سماجی ناہمواریوں اور برائیوں پر ایسا نشتر چلاتے ہیں کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے اور قاری ان کی ذہانت، مشاہدے اور تخلیقیت کا قائل ہوجاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ناسک اور مالیگاؤں میں اردو والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پروگراموں میں ہندی اور مراٹھی والوں کو بھی شامل کریں تاکہ اُس سے ایک دوسرے کے ادب کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع مل سکیں اور ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آسکیں۔

پروگرام کے اخیر میں فیاض احمد فیضی نے ناسک اور مالیگاؤں کے اہلِ ذوق سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے چالیس سالہ قلمی سفر کی داستان مزاحیہ پیرائے میں پیش کی جسے سامعین نے بے حد پسند کیا اور داد وتحسین سے نوازا۔ عثمان غنی اسکس کی قہقہہ آور نظامت میں منعقدہ اس تقریب کا اختتام رات کے ایک بجے ہوا۔

●●●

میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے دور میں موٹر چلانے کے لیے دیئے جانے والے لائسنس اور بٹن فیکٹری کی تصویریں

Regd. No. LII/RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-04 April, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے معتبر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطیٰ، یو کے، یو ایس اے اور کینیڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

... اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائیٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائیٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کر کے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469